شرابِ کہنہ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

شرابِ کہنہ

قلی قطب شاہ سے حالیؔ تک پچاس شاعروں کا
تعارف

از

رشید نعمانی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار
دہلی ۶

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ
بمبئی ۳

تعداد ۱۰۰۰

قیمت: ۳/۲۵

جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶

فہرست

پیش لفظ

کسی زبان کے مطالعے کے لیے اس کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات جاننا بہت ضروری ہے۔ دراصل یہ بنیاد ہوتے ہیں اس عمارت کی جو تکمیل کے بعد تاریخ ادب کہلاتی ہے۔ اُردو بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر ہم ادب اُردو کی تاریخ لکھنا چاہیں، تو لابُد ہے کہ ہم اپنے شعرا و ادبا کے حالات معلوم کریں۔

اس وقت تک جو مواد دستیاب ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۶۵ھ میں اُردو شعرا کے حالات میں پہلا تذکرہ میرؔ نے "نکات الشعرا" کے نام سے لکھا۔ اسی زمانے میں دو اور تذکرے لکھے گئے: قائمؔ نے "مخزن نکات" مرتب کیا اور حمیدؔ نے "گلشن گفتار"۔ اس کے بعد بیسیوں تذکرے لکھے گئے۔ اچھے بھی، برے بھی۔ لیکن قطع نظر ان کے معیار سے، یہ سب تاریخ ادب اُردو کے بنیادی ماخذ ہیں۔ اگر یہ نہیں ہوتے تو انسان تصور نہیں کر سکتا کہ وہ معلومات جو ان میں ملتی ہیں، اور کہاں سے اور کس طرح دستیاب ہو سکتی تھیں۔

ان سب تذکروں میں بعض باتیں مشترک تھیں۔ حالات بہت کم، دو ایک سطر میں نام، باپ کا نام، تلمذ کی طرف اشارہ یا خاندان کا کچھ ذکر اور اس کے بعد انتخاب اشعار۔ اگر شاعر صاحب دیوان ہے، تو انتخاب نسبتہً طویل ورنہ جتنے شعر مل سکے۔ شاعر کے حالات میں سنین پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ مختلف تذکروں کو یک جا کرنے سے بہت سا خام مواد جمع ہو گیا لیکن کچھ کمی کا احساس ہمیشہ رہا۔

اردو کا پہلا تذکرہ جس میں تفصیل اور تسلسل، تاریخ اور تنقید کا لحاظ رکھا گیا، مولانا محمد حسین آزاد کی "آب حیات" ہے۔ آزاد نے اردو کے آغاز سے لے کر اپنے زمانے تک مختلف ادوار قائم کیے۔ پھر ان کے نمائندہ شعرا کے حالات حتی الوسع پوری تفصیل سے لکھے۔ انھوں نے محض شاعر کے ذاتی حالات ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسے ماحول کا فرد بنا کر اس کی فعالیت اور انفعالیت دونوں کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی۔ اسی میں "آب حیات" کی خوبی اور خامی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس تصویر میں رنگ بھرنے کے لیے آزاد کو نہ صرف مختلف طریقوں سے حالات جمع کرنا پڑے، بلکہ انھیں دل چسپ اور دل کش بنانے کے لیے انھوں نے اپنے قیاس اور قوت اختراع سے بھی کام لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تاریخ اور افسانے کے ڈانڈے مل گئے۔ بعد کے کئی مصنفوں نے آزاد کی افسانہ طرازیوں پر بجا طور پر اعتراض کیا ہے، لیکن کوئی انصاف پسند "آب حیات" کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ آزاد کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مختلف لوگوں سے پوچھ پوچھ کر وہ حالات محفوظ کر دیے جو یقیناً ضائع ہو گئے ہوتے۔

ادھر کچھ عرصے سے تذکرہ نویسی کی جگہ افراد اور مشاہیر کی سوانح عمریاں مرتب کرنے پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ بہت اچھا کام ہے اور مفید بھی گا

لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سوانح عمری تذکرے کا بدل نہیں ہو سکتی تذکرہ مشہور اور غیر مشہور، اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز نہیں کرتا، اسی لیے اس کی افادیت کا دائرہ وسیع تر ہے، سوانح عمری سے یہ بات نہیں پیدا ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس مشغولیت اور افراتفری کے دور میں لوگوں کے پاس طویل اور ضخیم کتابیں پڑھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف علوم کے انسائیکلو پیڈیا یا دائرۃ المعارف مرتب ہو رہے ہیں، جہاں اس موضوع سے متعلق تمام معلومات قابل فہم طریقے پر یک جا کر دی جاتی ہیں، جس سے مراجعت آسان ہو جاتی ہے۔ یہ انسائیکلو پیڈیا سب ایک ہی معیار کے نہیں ہوتے۔ بعض ابتدائی درجے کے ہوتے ہیں، بعض بہت بلند درجے کے۔ اپنی اپنی جگہ دونوں مفید ہیں، کیونکہ ان کے پڑھنے والا حلقہ الگ الگ ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا، ادھر بہت دنوں سے اردو میں کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا اور جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی بڑوں اور اہل علم کے حلقوں کے لیے ہے جس میں تفصیلات اور جزئیات پر زور دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے عام پڑھنے والا مستفید اور لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے لکھنے والے اس طبقے کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر طوالت اور غیر ضروری تفصیل سے اجتناب کرتے ہوئے عام فہم زبان میں پیش کریں۔ اس سے نہ صرف ہمارے متوسط پڑھے لکھے طبقے کا رشتہ ادب سے قائم رہے گا، بلکہ کلاسیکی روایت کا رشتہ بھی نہیں ٹوٹے گا، جس کی حالت ہماری بے توجہی کے باعث بہت نازک ہو رہی ہے۔

رشید نعمانی صاحب نے اس تذکرے میں پچاس شاعروں کے مختصر حالات اور کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ انھوں نے کوئی نئی بات دریافت کی ہے۔ لیکن یہ ہی کیا کم ہے کہ اتنے سارے اساتذہ

کے صحیح حالات اور اچھے کلام ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں، جس سے انسان کتنی بڑی بڑی کتابوں کی ورق گردانی سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ خدا کرے ان کی یہ کوشش اہلِ علم کے نزدیک مقبول ثابت ہو!

مالک رام

نئی دہلی
یکم ستمبر ۱۹۶۷ء

عرضِ مرتب

پانچ سال ہوئے رسالہ "کتاب نما" کی ماہانہ اشاعتوں میں "شرابِ کہنہ" کے عنوان سے شاعروں کا تذکرہ شروع کیا گیا تھا۔ اس کے لکھنے میں جن باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا وہ یہ ہیں

۱۔ حالات مختصر ہوں اور مستند
۲۔ اشعار عام فہم ہوں اور عام پسند
۳۔ کلام سے شاعر کے رنگ و رجحان کا بھی اندازہ ہو سکے
۴۔ ولادت اور وفات دونوں لازمی طور پر سنہ عیسوی میں

بہت سے تذکرے اور تاریخی کتابیں موجود ہیں، کلیات، دواوین اور سوانح عمریوں کی بھی کمی نہیں۔ پھر بھی ایک اوسط درجے کے پڑھے لکھے آدمی کے لیے موجودہ حالات میں اُن سے مستفید ہونے کے امکانات محدود ہیں۔

اس کتاب کو نہ کوئی مکمل تذکرہ سمجھنا چاہیے اور نہ تحقیقی کارنامہ۔ ان اوراق میں اُردو کے نمائندہ اور کچھ ممتاز شاعروں سے تعارف کرا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر پڑھنے والوں کو اس میں دو چار باتیں بھی کام کی نظر آجاتی ہیں تو میں سمجھوں گا کہ میری حقیر کوششیں بے سود نہیں رہیں۔

نظم و نثر کی بہت سی کتابوں، متعدد رسالوں اور متفرق مضامین سے میں نے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ اس کا مجھے اعتراف ہے۔ اور ان کا حوالہ نہ دے سکا۔ اس کوتاہی کا اقرار — اسی طرح یہ بھی مانتا ہوں کہ

جدید ترین تحقیق اور حساب دانی کی رُو سے بعض واقعات اور سنہ، ممکن ہے درست نہ ہوں۔ پیدایش اور انتقال کی قابلِ اعتبار تاریخیں قمری مہینوں اور ہجری سنہ میں لکھی ہوئی ملتی ہیں، سنہ عیسوی سے ان کی مطابقت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

جن حضرات کے تعاون سے مدد سے یہ کتاب شائع ہو رہی ہے ان کا ذکر اور سپاس گزاری میرا فرض ہے۔

"شرابِ کہنہ" کا عنوان میرے کرم فرما جناب ولی شاہ جہاں پوری نے تجویز کیا تھا۔ ہر مہینے ایک شاعر پر لکھوانا اور پابندی کے ساتھ مسلسل چار برس تک رسالہ کتاب نما میں شائع کرتے رہنا، یہ کام محبی ریحان احمد صاحب عباسی کا رہا ہے۔

"تذکرے کی ترتیب و تکمیل میں مشفق و مکرم جناب تاباں صاحب کے مفید مشورے مجھے حاصل ہوتے رہے۔ محترمی مالک رام صاحب نے متعدد حیثیتوں سے میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ ان کی نوازشیں اور عنایتیں میسر نہ ہوتیں تو یہ کتاب شاید ابھی سامنے نہ آ سکتی۔

کتابت و طباعت کے مرحلوں سے گزرنا آسان نہ تھا۔ خدا بھلا کرے برادرم حبیب احمد خاں صاحب کا جنھوں نے مجھے ان فکروں سے بے نیاز رکھا۔

میں ان لوگوں کا بھی ممنون ہوں گا جو تذکرے کی خامیوں سے مجھے مطلع فرمائیں گے

جامعہ نگر نئی دہلی
یکم دسمبر ۱۹۶۷ء

رشید نعمانی

سلطان محمد قلی قطب شاہ قطب معانی

۱۵۶۹ء — ۱۶۱۲ء

سنہ ۱۵۸۱ء میں جب کہ اس کی عمر بارہ سال تھی تخت نشین ہوا گول کنڈہ سے کچھ فاصلے پر اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر "بھاگ نگر" آباد کیا۔ جو تھوڑے دنوں کے بعد حیدر آباد کے نام سے موسوم اور مشہور ہوا۔ بڑا خوش مذاق، تمام فنونِ لطیفہ کا قدر دان، فن تعمیر اور شعر و سخن سے بے حد دلچسپی اور واقفیت رکھنے والا بادشاہ گزرا ہے کہتے ہیں اس نے کم و بیش پچاس ہزار شعر کہے، اس کی شاعری میں مقامی رنگ و بو، ہندو مسلمانوں کے یہاں کی تقریبات، رسم و رواج، پرندوں اور حسین جانوروں کا ذکر کثرت سے نظر آتا ہے۔ فارسی کی تقلید سے الگ ہو کر تمام اصنافِ سخن میں کلام موجود ہے۔ انھیں کمالات و اوصاف کی بنا پر اس کو (دکنی) اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر بھی کہا جاتا ہے۔

انتخاب

گرجا ہے میگھ سر[1] تھے تازہ ہوائے بستاں
پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں

---

[1] پھر سے

اے خوش خبر صبا تُوں لے جا جواں فداں کن[1]
چھناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں
مج عشق کے گدا کوں اورنگ شاہی دیتا
سب عاشقاں پنج اچھے[2] ہیں طفل جوں دبستاں

پیا باج پیالہ پیا جائے نا — پیا باج یک تل[3] جیا جائے نا
کہتے تھے پیا بن صبوری کروں — کہیا جائے اما کیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند — دوانے کو کچ پند دیا جائے نا

نین ہیں دو پیاری کے جیسے ممولے — بھنواں کی ترازو سوں بھو جھیند تولے
چمن پھول سب باس خوش بو کا پائے — سگھڑ سندری جب اپس کیس کھولے
نظر جوت پایا ہے اس مکھ صفا تھے — کھلے دل کو اڑاں جو پیو بات بولے

رکھ ایک ہے ہر ٹھیک[4] کدھن لاکھ چمن ہے — لکھ جوت ہے ہر ٹھار دلے ٹھیک رتن ہے
کس ٹھار میں دسنا ئیں[5] سب ٹھار ہے بھرپور — دیکھن کو سکت کاں[6] نہ ہے ہر ٹھیک نین دو ہے
منج عشق گرمی آگ کا یک چنگی[7] ہے سورج — اس آگ کے شعلے کا دھواں سات گگن[8] ہے

---

[1] پاس [2] آگے۔ [3] یک لحظہ۔ [4] طرف، سمت۔ [5] دکھائی۔ [6] کہاں۔
[7] چنگاری۔ [8] آسمان

ولیؔ

۶۸ - ۱۶۶۷ ———— ۱۷۰۷ء

نام محمد ولی اللہ، تخلص ولیؔ۔ مولد اورنگ آباد (دکن)[1]، مدفن احمد آباد (گجرات)۔ تذکروں میں سال ولادت ۱۶۶۷ء اور ۱۶۶۸ء درج ہے مگر بقول نورالحسن ہاشمی "تاریخ ولادت کی تحقیق نہیں ہوئی ہے"۔ ۱۷۰۷ء میں وفات پائی۔ تعلیم احمد آباد میں حاصل کی۔ اپنے زمانے کے دینی اور دنیوی دونوں علوم سے واقف تھے۔ ۱۷۱۹ء میں ان کا دیوان دہلی پہنچا۔ عوام اور خواص دونوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی وقت سے صحیح معنوں میں دہلی اور شمالی ہندوستان کے دوسرے مقامات پر اردو میں شعر اور خاص کر غزل گوئی کا رواج ہوا۔ کلام میں دکنی الفاظ کی کثرت کے باوجود شعروں میں لطفِ ترنم اور اثر میں کوئی کمی یا دقت نہیں محسوس ہوتی ہے۔ بہت سے شعر تو بالکل آج کل کی زبان میں مل جاتے ہیں۔

سب سے پہلے گارساں دتاسی نے ۱۸۳۳ء میں پیرس سے ان کا کلیات شائع کیا۔ اس کے بعد بمبئی، پونا اور لکھنؤ سے مختلف اڈیشن چھپتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا احسن مارہروی مرحوم اور پھر ڈاکٹر

---

[1] سید ظہیر الدین مدنی کی تحقیق کی رو سے ولیؔ دکنی نہیں بلکہ گجراتی تھے۔

نورالحسن ہاشمی نے کلیات کو مرتب کیا اور ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی طرف سے شائع ہوا۔

انتخاب

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　کیا حقیقی و کیا مجازی کا
آج تیری بھنواں نے مسجد میں　　ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
اے ولی سرو قد کو دیکھوں گا　　وقت آیا ہے سرفرازی کا

پھر میری خبر لینے وو صیاد نہ آیا　　شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
مدت ستی مشتاق ہیں عشاقِ جفاکش　　بے داد کہ وو ظالمِ بے داد نہ آیا
پہنچی ہے ہر اک گوش میں فریاد ولی کی　　لیکن وو صنم سننے کو فریاد نہ آیا

فدائے دلبر رنگیں ادا ہوں　　شہیدِ شاہدِ گُل گوں قبا ہوں
ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں ذوق　　سخن کے آشنا کا آشنا ہوں
کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا　　طلب گارِ نگاہِ باحیا ہوں

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گُل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ
مرے دل کو کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ
ادا و ناز سوں آتا ہے وو روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

کسی کی بات سنتا نئیں کسی پر رحم کرتا نئیں!
ہٹیلا ہے، ستم گر ہے جفاجو ہے شرابی ہے
گیا ہے جب سوں وو گل رو چمن میں مے کشی کرنے
ہراک گل صورتِ ساغر ہراک غنچہ گلابی ہے
گلی میں اس ستم گر کی نہ جا اے دل نہ جا اے دل
کہ جانبازی میں آفت ہے قیامت ہے خرابی ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیوں کہ حاصل ہو تجھ کو جمعیت
زلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب
مجھ انکھیاں کا خمار کھوتی ہے

عشق بے تابِ جاں گدازی ہے
حسن مشتاقِ دل نوازی ہے
اشک خونیں سوں جو کیا ہے وضو
مذہبِ عشق میں نمازی ہے
اے ولی عیشِ ظاہری کا سبب
جلوۂ شاہدِ مجازی ہے

آبرو

متوفی ۱۷۳۳ء

نجم الدین، نام۔ شاہ مبارک، لقب۔ آبرو تخلص۔ گوالیار میں پیدا ہوئے۔ شاہ محمد غوث گوالیاری جو اپنے وقت کے ایک صاحب طریقت

بزرگ گزرے ہیں۔ ان سے بہت قریب کا واسطہ تھا۔

جوانی میں دہلی آگئے (کچھ دنوں نارنول میں بھی رہے تھے) شاعری کی ابتدا اور شہرت و استادی کا مرتبہ سب کچھ دہلی ہی میں رہ کر حاصل کیا۔ پچاس برس سے زیادہ کی عمر پا کر یہیں وفات پائی۔

پختہ کار اور مشاق ہونے کے باوجود سراج الدین علی خاں آرزو کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ عربی کی صرف و نحو اور علمی مسائل سے واقف اور آشنا تھے۔ ان کی زندگی میں اور مرنے کے بعد ہر ایک ان کی استادی کا قائل رہا۔ یہ بات بھی غلط نہیں کہ دہلی میں اردو شاعری کی بنیاد ڈالنے یا اس کا باقاعدہ آغاز کرنے والے اساتذہ اور بزرگوں میں آبرو کا نام سرِ فہرست ہے۔

تین باتیں آبرو سے متعلق اور بھی ہیں جن کا ذکر کم و بیش ہر تذکرہ نگار نے کیا ہے (۱) ایک آنکھ سے معذور (۲) مرزا مظہر جان جاناں سے چشمکیں (۳) میر مکھن پاک باز سے غیر معمولی اُنس اور اس کا طرح طرح سے اظہار۔ آبرو کا بہت سا کلام تلف ہو گیا۔ قلمی نسخے بعض کتاب خانوں میں موجود ہیں۔ ایک دیوان شائع ہو گیا ہے۔

اُردو کے چند قدیم اور ایہام گو شعرا میں آبرو کی حیثیت نمایاں ہے۔ ایہام کے علاوہ ان کے یہاں عجیب و غریب تشبیہیں، نامانوس الفاظ، بے جوڑ قافیے اور لفظی رعایتوں کی کثرت۔ اس بنا پر اگر ایک طرف ان کے شعر بے لطف اور بے رس نظر آتے ہیں تو دوسری طرف انداز و بیان میں شیرینی و شگفتگی یا محاوروں کی چاشنی کی بدولت بہت سے شعروں میں لطف کا سامان بھی موجود ہے۔ آبرو غالباً اردو کے

پہلے "واسوخت نگار" بھی تھے۔

انتخاب

دل تو دیکھو آدمِ بے باک کا
عشق سے پُتلا بھرا ہے خاک کا

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جُگ بیتا

قولِ آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

یہ سبزہ، یہ آبِ رواں اور ابر یہ گہرا
دیوانہ نہیں گھر میں رہوں چھوڑ کے صحرا

آیا ہے صبح نیند سے اٹھ رسمسا ہوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا
کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگِ زرد
سونا وہ ہے جو ہووے کسوٹی کسا ہوا
انداز سیں زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں
جو خال اپنی حد سے بڑھا سو مسا ہوا

رخسار کے گل اوپر یہ شبنم ہے یا پسینا
یا لال پر جڑا ہے الماس کی نگینا

حق میں عاشق کے مگر لطفِ ستم تھا یار کب
دل دیا جب سے مجھے تب سے نت آزار دیا

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی
اس دلِ بے قرار کی صورت

نہ تھا کچھ اور میرے شوق کا حسن وصفا باعث
بہی پیاری سی طرح موجب بہی کا فراوا باعث

مجلسِ زنداں میں مت لے جا دلِ بے شورش کو
شیشہ خالی کی کیا عزت ہے مے خواروں کے بیچ

کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح

جلتا ہے اب تلک ترے مکھڑے کے رشک سے ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گُل

نکلے تم آ صبا کی طرح جب چمن میں پھول گلشن کے دیکھ تجھ کو گئے ہاتھ پاؤں بھول

حُسن ہے یہ خوب رڈیوں میں وفا کی خو نہیں
پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نہیں

یار ہے غافل مرے درد سیں بے دار کرو بے خبر جان نہ جا جا کے خبردار کرو

دل کب آوارگی کو بھولا ہے خاک گر ہو گیا ، بگولا ہے

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتیں جب رو برو ہو تیرے گفتار بھول جاوے
کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد روح پتھر سے سر پٹکتی ہے

تاباںؔ

۱۷۰۸ ــــــــ ۱۸۰۰-۱۷۹۹ء

میر عبدالحی نام تاباںؔ تخلص۔ اساتذہ دہلی کے طبقۂ متقدمین میں ان کا شمار ہے۔ میر تقی میرؔ سے لے کر رام بابو سکسینہ تک نے شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ ان کے حسن و جمال کی تعریف کی ہے اپنے زمانے کے یوسفِ ثانی کہلاتے تھے۔ تمام خواص و عوام ان کے دید کے شائق اور ملاقات کے آرزومند رہا کرتے تھے۔ کم عمر پا کر انتقال کیا۔ موت کے ظاہری اسباب میں سے کثرتِ مے نوشی بھی بتائی جاتی ہے۔ کلام میں عشق کی شیرینی اور عاشقانہ زندگی کی کیفیتیں نمایاں ہیں۔ زبان صاف اور انداز سادہ و عام فہم ہے۔

کلام کا مجموعہ ۱۳۵۴ھ ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) کی طرف سے مولوی عبدالحق مرحوم نے شائع کیا تھا۔ اس میں بیشتر حصہ غزلوں کا ہے۔ ان کے علاوہ مخمس، مسدس، مثلث، ترکیب بند، مستزاد، قصیدہ، مثنوی، تضمینیں، قطعات اور تاریخیں شامل ہیں۔

انتخاب

خزاں تک تو رہنے دے صیاد ہم کو
کہاں یہ چمن پھر کہاں آشیانا

ہوا جا کے ظالم کے قابو میں بے بس — کہا ہائے اس دل نے میرا نہ مانا
ترے غم سے نسیاں ہے یاں تک کہ مجھ کو — اِدھر بات کہنا اُدھر بھول جانا

رہتا ہے خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہوا — میرے غریب دل کو الٰہی یہ کیا ہوا
ہیں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح — یارب کبھو خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا
ہم بے کسی پہ اپنی نہ روئیں تو کیا کریں — دل سا رفیق ہائے ہمارا جدا ہوا

آئی بہار شورشِ طفلاں کو کیا ہوا — اہلِ جنوں کدھر گئے، یاراں کو کیا ہوا
غنچے لہو سے تر نظر آتے ہیں تہ بہ تہ — اس رشکِ گل کو دیکھ گلستاں کو کیا ہوا

بچتا ہی نہیں ہو جسے آزارِ محبت — یارب نہ کوئی ہووے گرفتارِ محبت
آگے تو بہت دھوم تھی مجنوں کے جنوں کی — اب گرم مرے دم سے ہے بازارِ محبت
تا صبح جو کچھ جی میں ہو سو مجھ سے کرالے — کرنے کا نہیں ایک میں انکارِ محبت

لے میری خبر نسیم مرے یار کی کیوں کر — بیمار عیادت کرے بیمار کی کیوں کر

زلف کہاں، کہاں یہ رُخ، سنبلِ ارغواں کہاں
لعل کہاں یہ لب کہاں غنچہ کہاں دہاں کہاں
خانہ بخانہ، دربدر، کوچہ بکوچہ، دشت بدشت
غم میں ترے پھرے ہیں ہم روتے ہوئے کہاں کہاں
دونوں جہاں کا بے نصیب روزِ ازل سے میں بنا
یاں تو مجھے ہے رنج و غم راحت و عیش واں کہاں

قبلہ نہ سرکشی کرو حُسن پہ اپنے اس قدر
تم سے بہت ہیں کج کلاہ، خانہ بخانہ کو بکو
تیری کمندِ زُلف کے لاکھ بہ ملک... ہیں اسیر
بسملِ خنجرِ نگاہ، خانہ بخانہ کو بکو
سینہ فگار و جامہ چاک، گریہ کناں و نعرہ زن
پھرتے ہیں تیرے دادخواہ خانہ بخانہ کو بکو

دیکھا جو میری نبض کو کہنے لگا طبیب
مجنوں مرا تھا جس سے یہ آزار ہے وہی
آئی بہار کیوں کہ گریباں کو کرے چاک
ہاتھوں میں ہائے ضعف سے طاقت نہیں رہی

رباعی

ہوتے ہیں تیرے جب اشتیاقی ساقی
بےخود ہو لیکارتے ہیں ساقی ساقی!!
ہے ہم کو خمارِ شب کا، لا صبح ہوئی
شیشے میں جو کچھ کہ مے ہو باقی ساقی

رباعی

مے خانے میں کیا پھرے ہو مٹکے مٹکے
زاہد عابد سے، دور بھٹکے بھٹکے
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے کافر
یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکے اٹکے

یقین

۱۷۲۸ ——————— ۱۷۵۵ء

نواب انعام اللّٰہ خاں نام، یقین تخلص، دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہاں کے ایک مقتدر اور معزز خاندان کے مشہور افراد میں ان کا شمار تھا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ خود کچھ نہیں کہتے تھے بلکہ مرزا صاحب کہہ دیا کرتے تھے۔ مگر ان کے بہت سے ہم عصر اور بعد کے نقادوں اور تذکرہ نویسوں نے اس کی تردید کی ہے۔

وجیہہ، شکیل، خوش باش اور نازک طبع لوگوں میں سے تھے، درد، لذت، حسن، شوخی اور پختگی ان کے کلام کی ناقابلِ انکار خصوصیتیں ہیں۔

دیوان چھپ چکا ہے۔ جس میں ردیف وار کُل ۱۷۰ غزلیں ہیں اور ہر غزل میں صرف پانچ شعر۔ اس التزام و اختصار میں بھی وہ منفرد ہیں اور بہت سے شاعروں کے لیے باعثِ تقلید۔

یقین بہت تھوڑے دن زندہ رہے، ان کی موت بڑی حسرت ناک اور دردانگیز طریقے سے واقع ہوئی، مرزا فرحت اللّٰہ بیگ مرحوم نے بڑے اہتمام اور احتیاط کے ساتھ اُن کا دیوان شائع کیا اور بڑی چھان بین کر کے ان کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ یقین کو اپنے والد کی کسی برائی کی اطلاع ہو گئی اور انھوں نے اس طرح اپنے

راز کو افشا ہونے سے بچایا۔ دوسرے یہ کہ خود یقین ہے کوئی برائی ہوئی تھی اس لیے اپنے خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لیے ان کے والد نے ان کو قتل کیا۔ اور لاش کو دریا میں بہا دیا۔"

انتخاب

پھر کوئی سلسلہ جنباں ہوا زندان کے بیچ
آج زنجیر سے آتی ہے جھنک کان کے بیچ

لوگ اس وادی میں اب کرتے ہیں آہو کا شکار
بعدِ مجنوں یوں ہوئے بے کس غزالانِ العیاذ

کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی یوں چھوٹے
ہم ہوئے ایسے بُرے وقت میں آزاد کہ بس
تو نہ تھا جینے یقیں ورنہ دوا نہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

نزع میں دیکھ مجھے یار جھجک کر بولا
کیا بری طرح سے مرتا ہے یہ بیمار کہ بس

آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا
کیا خریدار نے پایا ہے خریدار کہ بس

عشق کے دارِ شفا میں مجھے لے چل کہ یقیں
کہ طبیبوں نے دیا اس قدر آزار کہ بس

بعد مرنے کے بھی ہوں گرد میں غمناک ہنوز
گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز

پی کے مستوں نے زمیں پر جو گرائی تھی شراب　　سبز ہوتا ہے اسی سے شجرِ تاک ہنوز

خوش نہیں آتا ہے مجنوں بن ہمیں صحرا ہنوز
ان غزالوں سے ہمارا دل نہیں لگتا ہنوز

ہم سے تھا ویرانہ ٹک آباد سو ہم بھی چلے　　اب خدا حافظ تمہارا اے غزالاں الوداع
آگ بھی بجھتی ہے اور سورج بھی ہوتا ہے غروب　　رات دن جلتا ہے یکساں داغِ حسرت کا چراغ

مصر میں حُسن کی وہ گرمیٔ بازار کہاں　　جنس تو ہے یہ زلیخا سا خریدار کہاں
عشق گر کیجیے یا دل کیجیے کس سے خالی　　درد و غم کم نہیں اس دور میں غم خوار کہاں

بن چاک، سینے بیچ محبت کی جا نہیں　　جس گھر کا در کھلا نہیں اس میں ہوا نہیں
کعبے کبھی میں گیا، نہ گیا ان بتوں کا عشق　　اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

بت پرستی میں موحد نہ سنا ہوگا کبھو
کوئی تجھ بن مرا واللہ کہ معبود نہیں

خدا کرے نہ گروں عشق کی میں نظروں سے　　کسو کی چشمِ حقارت سے کچھ ملال نہیں

تماشا کر تصور کو کہ ہر اک اشک میں میرے
تری صورت نظر آتی ہے جوں شیشے میں تصویریں

ہم تو چلے ہیں یارب آباد رکھیو۔ ان کو
ان باغچوں میں کیا کیا دھومیں مچائیاں ہیں

اسیرانِ قفس کی ناامیدی پر نظر کیجو
بہار آوے تو اے صیاد مت ہم کو خبر کیجو

عشق میں داد نہ چاہو کہ سنا ہم نے نہیں
عدل وانصاف کا اس ملک میں دستور کبھو

دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا
اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیے
تحقیق کو ظالم نے ٹک کام نہ فرمایا
فرہاد کے اس ناحق مرجانے کو کیا کہیے

مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے
نہیں معلوم میرے بعد ویرانے یہ کیا گزرا

ہے ترے داغ سے تر سینۂ سوزاں میرا
آب در رنگ آگ سے رکھتا ہوں گلستاں میرا

آرزو

۱۶۸۷ء —— ۱۷۵۶ء

سراج الدین علی خاں نام، آرزو تخلص، معروف بہ خان آرزو۔

والد کا نام حسام الدین، حسام، وطن آگرہ، نسبی سلسلہ شاہ محمد غوث گوالیاری سے ملتا ہے۔ میر تقی میر کے (سوتیلے) ماموں بھی تھے۔ چوبیس برس کے سن میں تعلیم مکمل کر لی تھی اور گوالیار میں ملازم ہو گئے تھے۔ مگر وہاں جی نہ لگا اور ۱۷۱۹ء میں دہلی چلے آئے۔ نادر شاہی حملے کی وجہ سے جب دہلی کی فضا خراب ہونے لگی تو لکھنؤ چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ مگر وصیت کے مطابق لاش کو دہلی لا کر دفن کیا گیا۔

خان آرزو دراصل فارسی کے شاعر تھے اردو میں انھوں نے بہت کم کہا ہے اس کے باوجود اردو ہی کے تمام شعرا ان کی استادی کے قائل ہیں۔ انھیں کے مشورے سے سودا نے اردو شاعری کی طرف توجہ کی تھی۔ میر نے لکھا ہے کہ اپنے دور کے وہ سب سے بڑے محقق اور شاعر شیریں بیان تھے۔ گردیزی نے ان کو چراغ محفل فصاحت قرار دیا ہے میر حسن کے نزدیک ہندوستان میں امیر خسرو کے بعد یہی سب سے بڑے شاعر ہیں۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ اردو کو ان کے ساتھ وہی نسبت ہے جو ارسطو کو فلسفے کے ساتھ۔ غرض معاصرین سے لے کر بعد کی نسل تک کے تمام ... بڑے شاعروں، تذکرہ نگاروں اور مبصروں نے ان کی علمیت کا اعتراف اور ان کی متعدد صلاحیتوں کا اقرار کیا ہے۔

فارسی پر تو ان کو عبور حاصل تھا ہی اردو میں بھی جو خاص خاص محاورے اور روزمرہ وہ نظم کر گئے ہیں وہ اپنی جگہ آج بھی لطیف اور مستند ہیں۔

تقریباً تیس ہزار فارسی اشعار پر مشتمل ایک ضخیم دیوان کے علاوہ متعدد کتابیں اور رسالے بھی تصنیف و ترتیب دیے۔ جن میں

بعض کے نام یہ ہیں۔ رسالہ تنبیہ الغافلین، جس میں شیخ علی حزیں کے کلام پہ اعتراضات ہیں۔ "سراج اللغات" (فارسی) اور ایک لغت اُردو موسوم بہ "تصحیح غرائب اللغات" (نوادر الفاظ) فن بلاغت و معانی کے بیان میں دو کتابیں، "مجمع النفائس" کے عنوان سے ایک تذکرہ جس میں آغاز سے معاصرین تک (فارسی گو) شعرا کا ذکر ہے۔

انتخاب

کہا یوں صاحب محمل نے سن کر شور مجنوں کا
تکلف کیا جو نالہ بے اثر مثل جرس پہنچا

ہر صبح آ دکھاتا ہے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک
کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو
اس تندخو صنم سے ملنے لگا ہوں جب سے
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو
اب خواب میں ہم اس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے
وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

داغ پروانے کی الفت سے ہی روتے روتے
شمع نے جاں دیا صبح کے ہوتے ہوتے
داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے
کس بری رؤ سے ہوئی ہے شب کو مری چشم دوچار
کہیں دیوانہ اٹھا خواب سے سوتے سوتے

عبث دل بے کسی اپنی پہ توں ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دِوانے، عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے

دریا عرق میں ڈوبا تجھ صاف تن کے آگے
موتی نے کان پکڑے تیرے سخن کے آگے

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
بے کار ہے اٹک، نہ رہے دل تو کیا کرے

رکھے سی پارۂ گل، کھول آگے عندلیبوں کے
چمن کے بیچ گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

مے خانے آج جا کے شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

جان تجھ پہ کچھ اعتماد نہیں　　زندگانی کا کیا بھروسا ہے

سراج اورنگ آبادی

۱۷۱۵ —— ۱۷۶۱ء

شاہ سراج الدین سراجؔ ولی کے بعد دکن کے قدیم اور مشہور شاعر ہیں

میں انھیں کا نام لیا جاتا ہے۔

بارہ سال اپنے والد سید درویش کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے ایکایک۔ وحشت و بےخودی میں مبتلا ہو کر گھر سے نکل برہنہ تن جنگلوں میں دیوانہ وار پھرتے رہے اور شعر کہتے رہے۔ عاجز ہو کر والدین نے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ سات سال تک یہی حالت رہی، بالآخر چند بزرگوں کے فیض اور ان کی صحبت و ارادت سے سکون میسّر ہوا۔ ۴۲ سال کی عمر میں ایک دیوان مرتب ہو گیا تھا جس میں پانچ ہزار شعر تھے۔

قریب قریب سب ہی اصناف سخن میں کلام موجود ہے۔ مگر غزلوں میں کیف و ترنم، سوز و گداز اور مثنویوں میں قلبی واردات کی لطیف عکاسی ان کا ایک امتیازی وصف اور قابل قدر کارنامہ ہے۔ خیالات کے اظہار میں فارسی شعرا کا اثر اور دکنی الفاظ کے ساتھ ساتھ بہادری یا حسن و عشق کی مثالوں کے لیے خالص ہندی مشاہیر و اوتاروں کے نام بلا تکلف استعمال کیے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں "سراج سخن" کے نام سے عبدالقادر سروری صاحب نے بسیط مقدمے کے ساتھ کلام کا انتخاب شائع کیا۔

انتخاب

قدرِ امرِ دیدہ داں تھا مجھے معلوم نہ تھا
گلشنِ دل میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

دھوپ میں غم کی عبث جی کو جلایا افسوس
اس کے سائے میں اماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

خاک تیرے قدمِ پاک کی اے نورِ نگاہ
سُرمۂ دیدۂ جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

شبِ ہجراں کی نہ تھی تاب مجھے مثلِ سراجؔ   رُخ ترا نور فشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

آہِ سوزاں ہیں مری، دامنِ صحرا میں سراجؔ
قبرِ مجنوں پہ چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا

مشتاق ہوں تجھ لب کی فصاحت کا ولیکن   رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز
تو خسروِ خوباں ہے کہ لے منہ سیں تا بدم   پہنچی ہے ترے حسنِ جہانگیر کی آواز
دیوانے کوں مت شورِ جنوں یاد دلاؤ   ہرگز نہ سناؤ اُسے زنجیر کی آواز

بہار ساقی ہے بزمِ گلشن، ہیں مطرباں چمن شرابی
پیالہ گل سرو سبز شیشہ شراب بو اور کلی گلابی
ہوا شفق پوش باغ و صحرا محیط ہے رنگِ لالہ و گل
غبارِ گلگوں ہے آبِ رنگیں، زمیں ہے سرخ اور ہوا شہابی
سراجؔ اُس شوخ چشم کوں کہہ کہ باغ میں منتظر ہے نرگس
ہجومِ شبنم سیں لے کے موتی نثار کرنے کوں بھر رکابی

یار کی وضع بے حجابی ہے   شوخ ہے مست ہے شرابی ہے
خالِ موزوں صنم کے ابرو پر   نقطۂ فردِ انتخابی ہے
کشورِ دل میں تجھ جدائی سیں   ظلم ہے شور ہے خرابی ہے

بھولے ہیں ہر صنم کے کرشموں پہ ہوش کیوں   ان زاہدوں میں کشفِ کرامت نہیں رہی

مت ہو بہارِ گلشن دنیا کا عندلیب
ان پھول بن میں بوئے رفاقت نہیں رہی

خبرِ تحیرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
شۂ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب میں اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شرابِ صد قدحِ آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی
ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں ہوا یہاں
کہ نہ آئینے میں رہی جِلا، نہ پری کوں جلوہ گری رہی
کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراجؔ کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا، مگر ایک بے خطری رہی

سوداؔ

۱۷۰۶ —— ۱۷۸۰ء

مرزا محمد رفیع نام اور سوداؔ تخلص ہے، ان کے والد مرزا محمد شفیع اپنا خاندانی پیشہ سپہ گری اور اپنا آبائی وطن بخارا چھوڑ کر تجارت کی

غرض سے ہندوستان آئے اور دہلی میں مقیم ہو گئے۔ نعمت خاں عالی کی بیٹی سے شادی ہوئی اور انھیں کی کوکھ سے مرزا کا جنم ہوا۔

رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ بچپن اور نوجوانی کا زمانہ بڑی فراغت اور عیش و عشرت میں گزرا، کچھ دنوں فوج میں بھی ملازم رہے تھے اور جب وہاں سے الگ ہوئے تو شاعرانہ حیثیت سے اس مرتبہ تک پہنچ چکے تھے کہ ہر امیر کی محفل میں ان کا رسوخ تھا اور ہر فرماں روا تک ان کی رسائی۔

شاہ حاتم کے شاگرد تھے، پہلے فارسی میں کہتے تھے، خان آرزو کی تحریک یا مشورے سے اُردو میں کہنا شروع کیا اور زیادہ دن نہیں لگے کہ اپنے وقت کے مسلم الثبوت استاد مان لیے گئے۔

ان کی زندگی سے لے کر آج تک اُردو شاعروں کا کوئی تذکرہ اور کوئی تاریخ ایسی نہیں لکھی گئی جس میں سوداؔ کی شاعرانہ عظمت اور ان کی قادر الکلامی کا بہتر سے بہتر لفظوں میں ذکر نہ کیا گیا ہو۔

کوئی صنفِ سخن ایسی نہیں ہے جس میں طبع آزمائی نہ کی ہو، غزل میں بجز میرؔ کے باقی اپنے دور کے تمام شاعروں میں نمایاں، قصیدے میں ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا اردو شاعر ملتا ہی نہیں۔ اسی طرح ہجو گوئی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرثیہ لکھنے میں جس اسلوب اور جدّت سے کام لیا ہے اس کی بنا پر اپنے سے پہلے کے تمام مرثیہ نویسوں میں منفرد اور بعد کے لوگوں کے لیے قابلِ تقلید ثابت ہوئے۔ مختصر یہ کہ اردو زبان کو نکھارنے اور جان دار بنانے میں مرزا سوداؔ کا بہت بڑا ہاتھ اور حصّہ ہے۔

۴۳ سال دلّی میں رہے۔ ۱۷ سال فرخ آباد میں۔ اس کے بعد

۶۰ سال کی عمر میں پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ پہنچے، شہرت، مقبولیت، اور قدر افزائیاں آخر دم تک ساتھ رہیں۔ بہ ماہ رجب ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء میں وہیں وفات پائی، آغا باقر کے امام باڑے میں مدفون ہوئے۔

انتخاب

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا — پانی بھی پھر پئیں تو مزہ ہو شراب کا
دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر — لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا
تھا کس کے دل کو کشمکشِ عشق کا دماغ — یارب بُرا ہو دیدۂ خانہ خراب کا

جوں شمع تن ہوا شبِ ہجراں میں صرفِ اشک — پر جس قدر میں چاہوں تھا اتنا نہ رو سکا
سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے رُو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو — پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار — خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنسِ گراں کا

نالہ سینے سے کرے عزمِ سفر آخرِ شب — راہ رو باندھے ہے چلنے پہ کمر آخرِ شب
سانس ٹھنڈی کسی مایوس کی ہے ورنہ نسیم — کر سکے ہے ترے کوچے سے سفر آخرِ شب
روکوں نالے کو نہ لب پر تو کروں کیا اے دل — شام تاثیر نہ اس میں نہ اثر آخرِ شب

برسات کا تو موسم کب کا نکل گیا پر
مژگاں کی یہ گھٹائیں اب تک برستیاں ہیں

پاسِ ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
ورنہ یاں کون سا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں
دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

کیوں میں تسکینِ دلِ یار کروں یا نہ کروں نالہ جا کر پسِ دیوار کروں یا نہ کروں

ناتواں مرغ ہوں میں اے رفقائے پرواز اتنا آگے نہ بڑھو تم کہ رہا جاتا ہوں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب ہی یہ راتیں
دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

اس دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو قسمت میں جو لکھا ہو الٰہی شتاب ہو

گُل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی

اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

اتنا لکھ آئیو مری لوحِ مزار پر
یاں تک نہ ذی حیات کو کوئی خفا کرے

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا، کیا کرے

سوؔدا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

پھر نظر تجھ کو نہ دیکھا کبھو ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

جس روز کسی اور پہ بے داد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

میرزا مظہر جانِ جاناں

۱۷۰۰ ـــــ ۱۷۸۱ء

والد کا نام میرزا جان۔ اورنگ زیب کے دربار سے متوسّل تھے۔

امارت کی زندگی سے کنارہ کش ہو کر آگرے چلے آئے اور فقر و درویشی اختیار کر لی۔

میرزا مظہر کالا باغ (واقع حدود مالوہ) میں پیدا ہوئے، بادشاہ نے "جانِ جان" نام تجویز کیا جو لبعد میں "جان جاناں" بن گیا مظہر تخلص اور شمس الدین حبیب اللہ لقب تھا۔ بڑے خوش خلق، شگفتہ طبیعت اور نفیس مزاج لوگوں میں سے تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت والد بزرگوار سے حاصل کی۔ درسی اور متداول علوم کے علاوہ اسلحہ کے استعمال، سپہ گری کے فن، خاص طور سے خنجر زنی اور مدافعت کے طرح طرح کے طور طریقوں اور جامہ تراشی کے متعدد اصولوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ۱۸ سال کی عمر سے بیعت و ریاضت کا باضابطہ سلسلہ شروع کر کے صرف چار سال میں ان مدارج و مراتب پر پہنچ گئے جس کے لیے لوگ عمریں گزار دیتے ہیں۔

شعر و شاعری کا ذوق خمیر میں شامل تھا۔ جوں جوں ان کی توجہ تربیت باطنی کی طرف بڑھتی گئی اس شغل اور شوق میں کمی آتی گئی۔ میرزا صاحب زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے، ایک بار ان کے احباب اور ارادت مندوں نے منتشر کلام یک جا کیا تو اشعار کی تعداد بیس ہزار نکلی۔ ان میں سے خود انتخاب کر کے صرف ایک ہزار اشعار باقی رکھے اور انیس ہزار قلم زد کر دیے۔ اس کے مقابلے میں اُردو کلام بہت کم ہے۔ مولوی عبدالرزاق صاحب قریشی نے بڑی جستجو اور تحقیق کے بعد ان کا جو اُردو کلام فراہم کیا ہے اس میں کل ۱۲۴ شعر اور ۱۶ شعروں کی ایک نظم ہے۔ اس کے باوجود مرزا صاحب کا نام اُردو کے قدیم اور ممتاز ترین

شعراء میں لیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مرزا صاحبؒ اردو شاعری کے اوّلین مصلحوں میں ہیں۔ صنعت ایہام کی کثرت اور گرم بازاری نے ہماری شاعری کو اس قدر بے لطف کر رکھا تھا کہ اگر اس سے اجتناب اور اس کی اصلاح کی طرف قدم نہ اٹھایا جاتا تو اس کی ترقیاں مسدود اور دل آویزیاں محدود ہو کر رہ جاتیں۔ اس سلسلے میں حاتمؔ، سوداؔ، اور قائمؔ کی بھی کوششوں کو بڑا دخل ہے مگر پیش روی کا سہرا مرزا مظہر جانِ جاناں کے سر رہے گا۔

ترکِ ایہام کے علاوہ مرزا صاحب کا اردو شاعری پر بھی ایک احسان ہے کہ انھوں نے تغزل کے معیار کو بلند کیا۔ بوجھل، غیر مانوس، صوتی اور تحریری اعتبار سے غلط لفظوں کی جگہ رواں آسان اور صحیح الفاظ کو مستعمل اور رائج کیا۔

۷ محرم الحرام ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۳ء کی رات کو ایک سنگ دل کے طمنچے سے سخت مجروح ہو کر ۱۰ محرم کو شہادت کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ کرب و جاں کنی کے عالم میں اپنا ہی ایک شعر زبان پر تھا۔ لفظی اور معنوی ہر حیثیت سے جیسا یہ شعر خود ان پر صادق آیا ہے شاید ہی کسی شاعر کو یہ رتبہ اور اس کے شعر کو اتنی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہو۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

دلی جسے عرصے سے اپنا مسکن قرار دے رکھا تھا اسی شہر کے محلہ چتلی قبر کی ایک حویلی میں مدفون ہوئے اور لوحِ مزار پر بھی انھیں کا یہ شعر کندہ کیا گیا جو پڑھنے والوں کو ان کی سیرت اور شخصیت کی

یاد ہوتا رہے گا ۔ ۵

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جُز بے گناہی نیست تقصیرے

انتخاب

گئی آخر جلا کر گُل کے ہاتھوں آشیاں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بُلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گُل اپنا، باغباں اپنا
مرا جلتا ہے دل اس بلبلِ بے کس کی غربت پر
کہ گُل کے آسرے پر جن نے چھوڑا آشیاں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن، اپنے کو ہے ظالم
یہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا جانِ جاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا　　اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بے کس افسوس　　کیا ہوا اس کے تئیں اتنا تو بیمار نہ تھا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں! کیا مفت جاتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

مجھ پر ہوا ہے تنگ تجھ عرصۂ سخن
بولوں نگہ کو تیغ، تو ابرو کو کیا کہوں
مدت سے اس خیال کے آیا ہوں پیچ میں
گر مو کہوں کمر کو تو گیسو کو کیا کہوں

رشتۂ جاں ہی گر ہو تارِ دامن
آہ اس پر بھی سمجھتا ہے تو بارِ دامن
دیکھ کر گل نے کہا تجھ پر نزاکت ہے ختم
کس ادا سا تھ لچکتا ہے یہ مارِ دامن

آتش کہو، شرار کہو کہ بلا کہو
مدت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

اُس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے پڑا ہوں چمن میں ہوا کے ہاتھ
برگ حنا اوپر لکھو، احوالِ دل مرا!
شاید کبھی تو جا کے لگے دل ربا کے ہاتھ

کبھو اس دل نے آزادی نہ جانی
یہ بلبل تھا قفس کا آشیانی
خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

الٰہی مت کسو کے بیچ، رنج و انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

برچھی کوہ پکڑ ہاتھ میں آتے ہو اکیلے کیا راج بہادر ہو سجن روپ نگر کے

درد

۱۷۲۰ — ۱۷۸۵

خواجہ میر نام، دردؔ تخلص، جدِّ امجد عالم گیر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ والد ماجد خواجہ ناصر عندلیبؔ، باکمال شاعر، ذی علم اور روشن ضمیر بزرگ تھے۔

میر دردؔ نے قرآن، حدیث، فقہ اور تفسیر کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور اس میں کامل دستگاہ پیدا کی، درویشی کے ساتھ ساتھ شاعری اور موسیقی سے شغف اور ذوق ان کو ورثے میں ملا تھا۔

اٹھائیس برس کی عمر سے اپنی جاگیر اور دنیا کے دوسرے دھندوں اور دل چسپیوں سے الگ ہو کر فقر و عبادت میں مشغول رہنے لگے، والد کے انتقال کے بعد ۳۹ برس کے سن میں باقاعدہ طور پر ان کے سجادہ نشین قرار دیے گئے۔ دلی کا کوئی انقلاب، خون ریزیوں کے واقعات یا لوٹ مار کا خوف ذرہ برابر ان کے عزم و ثبات، استقلال و استغنا میں فرق نہ لا سکا ہر لحاظ سے مردِ درویش، اور فقیر متوکل اللہ کہے جانے کے مستحق ہیں۔

تمام عمر نہ کسی امیر یا سلطان کے در پر قدم رکھا اور نہ خوشامد یا کسی کی ہجو سے زبان و قلم کو آلودہ کیا۔ معاصرین سے لے کر آج تک ہر مسلک و ملت کے لوگ ان کی بزرگی کا اعتراف اور ان کی شخصیت کا احترام کرتے آئے ہیں۔ فارسی اور اُردو دیوان کے علاوہ مذہب، اخلاقیات اور تصوف کے سلسلے کی سات کتابوں کے مصنف ہیں۔ "رسمی عشق بازی" میں کبھی "گرفتار" نہیں ہوئے۔ وقت کا زیادہ حصہ سلوک و معرفت کی منزلیں طے کرنے میں صرف کیا، فرمائش یا ستائش کی خاطر کبھی شعر نہیں کہا، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام تکلف اور تصنع سے پاک، سادگی اور اثر کا مرقع اور حقیقتوں کا آئینہ دار ہے۔ اُردو میں اتنی صاف، بے لوث اور صحیح معنوں میں صوفیانہ شاعری میر دردؔ کے علاوہ اور کسی نے نہیں کی۔

انتخاب

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم سے
وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں   کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا   اور دل میں بھروسا ہے تو تیرے ہی کرم کا

آشیانے میں دردِ بلبل کے   آتشِ گل سے آج پھول پڑا

کر چکا اپنی سی عیسیٰ بھی تو، پہ کیا حاصل
ہیں گئے ویسے ہی تری چشم کے بیمار ہنوز
موڑیو منہ نہ ابھی سوزنِ مژگاں ہم سے
ٹانکے زخموں میں تو ہیں کتنے ہی درکار ہنوز
اور تو چھوٹ گئے مر کے بھی اے کنجِ قفس
ایک ہم ہی رہے ہر طرح گرفتار ہنوز

یارب درست گو نہ رہوں تیرے عہد میں
بندے سے پر نہ ہو کوئی بندہ شکستہ دل

ہوں قافلہ سالارِ طریقِ قدما درد
جوں نقشِ قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو   دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول   منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ
ہم گلشنِ دوراں میں اے خفتگیٔ طالع
سرسبز تو ہیں لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ
بدخواہ سبھی عالم، گو ہووے تو ہو لیکن
یارب نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل و دیدہ

کاش تا شمع نہ ہوتا گزرِ پروانہ
تم نے کیا قہر کیا! بال و پرِ پروانہ
شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اُسے
پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ
ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اُس نے
راہ رو رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ

کون وہ بے سروساماں ہے کہ یارب جز اشک
جس کی خاطر کبھی برسات نہ ہونے پائی

تہمتِ چند اپنے ذمّے دھر چلے
جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سُنا ہے بھر چلے

اک آن سنبھلتے نہیں اب میرے سنبھالے
بے طرح کچھ ان آنسوؤں نے پاؤں نکالے

ایسے سے کوئی اپنے تئیں کیوں کہ بچا وے
دل زلفوں سے بچ جائے تو آنکھوں سے چُرا لے
پھر آگے قیامت ہے اگر اب بھی نہ آوے
فرصت کے جدائی کے دن اتنے تو ہیں ٹالے

قطعہ

اتنا پیغام درد کا کہنا　　گر صبا کوئے یار سے گزرے
کون سی رات آن ملیئے گا　　دن بہت انتظار میں گزرے

میر حسن

۱۷۲۷ ـــــــ ۱۷۸۶ء

نام غلام حسن، تخلص حسنؔ۔ میر امامی امیر حسن کے پردادا ہرات سے ہندوستان آئے اور دہلی میں مقیم ہو گئے۔ یہ بزرگ ہفت قلم اور فاضل متبحر ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے شاعری کا سلسلہ اس خاندان کی سات آٹھ پشتوں تک چلتا رہا ہے۔ میر حسن کے دادا خواجہ عزیز اللہ والد میر ضاحکؔ ان کے بیٹے میر حسن انکے پھر میر حسنؔ کے تین صاحبزادے محسنؔ۔ خلیقؔ اور خلقؔ ان کے بعد انیسؔ، مونسؔ اور انسؔ۔ ان میں سے ہر ایک آسمان شاعری پر ستارہ بن کر چمکا اور میر انیسؔ جیسا باکمال تو

آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس معاملے میں میر حسن کے خاندان کو جو طرۂ امتیاز حاصل ہوا اس کی نظیر تاریخِ عالم مشکل سے پیش کر سکے گی۔

میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ابتدا ہی سے شعر و سخن کا ذوق اور اس سے شغف رہا۔ میر درد کی خدمت میں رہ کر پختگی حاصل کی۔ میر ضیا کے شاگرد تھے، میر درد اور سودا کے پیرو۔

آغازِ شباب میں والد کے ساتھ فیض آباد گئے، وہاں سے لکھنؤ اور پھر یہیں مستقل بود و باش اختیار کر لی۔

اُردو کے شعری سرمائے میں ان کی بدولت تقریباً سات ہزار شعروں کا اضافہ ہوا جس میں غزلیں، مثنویاں، قصیدے، مخمس، مسدس، مثلث، اور ترکیب بند (واسوخت) وغیرہ سب شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ترتیب دیا ہوا ایک قابلِ قدر تذکرۂ "شعرائے اُردو" ان کے نام کو باقی رکھنے کے لیے کچھ کم نہ تھا مگر ان کی جاودانی شہرت کا سبب ان کی مثنوی "سحرالبیان" ہے جس کی مقبولیت کا نہ کوئی جواب ہے اور نہ حساب۔

ایک فرضی منظوم قصے میں بقول سر راس مسعود "قدرت کے مناظر انسانوں کی بولتی چالتی تصاویر، غم و رنج کے جذبات، شادی و حسرت کے کوائف کو جس خوبی سے دکھایا ہے اس کی متقدمین اور متاخرین کے کلام میں مثال نہیں ملتی۔"

انتخاب (مثنوی سحرالبیان)

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر	وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت	اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

برس پندرہ ایک کا سِن و سال نہایت حسین اور صاحب جمال
وہ ابرو کہ محرابِ ایوانِ حُسن جھکی شاخِ نخلِ گلستانِ حُسن
نگہ آفتِ چشم عین بلا! مژہ دیں صفوں کی الٹ برملا
وہ بینی کہ جس کی نہیں کچھ نظیر ہے انگشتِ قدرت کی سیدھی لکیر
وہ رخسار نازک کہ ہو جائے لال اگر اس پہ بوسے کا گزرے خیال
قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام قیامت کرے جس کو جھک کے سلام
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

سدا عیشِ دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
بہم دو دلوں میں جو ہوتی ہے چاہ تو بھرتی ہے دل کے تئیں دل سے راہ
تپِ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ اکیلی لگی رونے منھ ڈھانپ ڈھانپ
جہاں بیٹھا پھر نہ اٹھنا اسے محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

تغزل

کہا میں کہ بھرتا ہوں دم آپ کا لگا کہنے صاحب کرم آپ کا

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

قمارِ محبت میں بازی سدا وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا

لگتا ہے مجھ کو آج یہ سارا جہاں خراب شاید کہ مر گیا ہے کوئی خانماں خراب

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

صیاد کی مرضی ہے کہ اب گُل کی ہوس میں نالے نہ کریں مرغ گرفتارِ قفس میں

پہنچے نہ حسن منزلِ مقصود کو ہم اور آخر ہوئے سب زیست کے ایام سفر میں

ناز سے، عشوے سے، غمزے سے لگا لیتے ہیں وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

دی تھی یہ دعا کس نے مرے دل کو الٰہی اجڑے یہ گھر ایسا کہ پھر آباد نہ ہووے

نغمۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

عیش و وصال و صحبتِ یاراں فراغِ دل
اس ایک جان کے لیے کیا کیا نہ چاہیے

حاتم

۱۶۹۹ — ۱۷۹۱ء

ظہور الدین نام، پہلا تخلص رمز دوسرا حاتم۔ شیخ فتح الدین کے بیٹے، مولد و مدفن دہلی۔ سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ اسلاف کا وطن اور تعلیم و تربیت کے معاملے میں تذکروں سے کوئی خاص سراغ نہیں ملتا ہے۔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں صوبہ الہ آباد کے مصاحب کی حیثیت سے تھوڑے دنوں تک عیش و فارغ البالی کی زندگی گزاری۔ اس کے بعد فقیری کی طرف مائل ہو گئے۔ میر باذل علی شاہ کے مرید ہوئے۔ رفتہ رفتہ دنیاوی مشاغل وانہماک سے تائب اور کنارہ کش ہو گئے۔ لال قلعے سے متصل شاہ سلیم کا جو تکیہ تھا پچاس برس تک وہاں کے مستقل حاضر باشوں میں رہے۔

جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا، اس کی شہرت اور مقبولیت دیکھ کر انھوں نے بھی 'ریختہ' میں شعر کہنا شروع کر دیا اور تھوڑی ہی مدت میں اپنی اُستادی کا لوہا منوا لیا۔

میر تقی میر نے اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں حاتم کو "مرد جاہل و متمکن" ضرور لکھا ہے باقی تذکرہ نویسوں نے ان کی شاعرانہ صلاحیت،

خوش طبعی اور وضع داریوں کی تعریف کی ہے۔ ایک موقع پر انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا ؎

سر کو پٹکا ہے کبھو، سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

سعادت یار خاں رنگین جو خود حاتم کے شاگرد تھے، بول اٹھے کہ دوسرا مصرع اگر اس طرح ہوتا تو اچھا ہوتا ع

ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

حاضرین کو یہ گستاخی پسند نہ آئی مگر شاہ صاحب نے نہایت خندہ پیشانی اور فراخ دل کے ساتھ اس مصرعے کو قبول کر لیا اور کہا "واللہ میں دیوان میں اسی طرح لکھوں گا۔"

شاہ حاتم وہ پہلے بزرگ ہیں جن کو اصلاح زبان کا بھی خیال ہوا، سب سے پہلے اپنے ضخیم سرمایہ شعری سے ایسے اشعار خارج کئے جو معنی و مطلب کے لحاظ سے بے لطف، ایہام سے پُر اور غیر مانوس یا غیر فصیح الفاظ کا مجموعہ تھے۔ (اسی انتخاب کا نام انھوں نے "دیوان زادہ" رکھا، اس میں پانچ ہزار شعر ہیں)

ان کا دوسرا قابل لحاظ کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کی درستی کے سلسلے میں کچھ اس قسم کی کوششیں بھی کی تھیں جو ان کے سو برس بعد ذوق اور مومن، ناسخ اور آتش کے ذریعے مقبول اور کامیاب ہوئیں۔

حاتم اپنے دور کے ۴۵ شاعروں کے استاد تھے، جن میں سودا، رنگین، تاباں اور فائز جیسے لوگ شامل ہیں انھیں کمالات

کی وجہ سے وہ "رنگ دہلی" کے موجد بھی کہلاتے ہیں۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی ان کا دیوان ہے۔ مجموعی حیثیت سے انؒ کا کلام صاف عاشقانہ اور کہیں کہیں عارفانہ ہے، شعر آپس میں باتیں، زبان صاف اور سلیس۔ البتہ زبان کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے اکثر زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔" آزاد (محمد حسین) اور سکسینہ کی اس ملی جلی رائے سے دوسرے نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے اختلاف نہیں کیا ہے۔

انتخاب

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا   مانندِ خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
تھا جگ سوں مجکو نہیں ایک دم فراغ   حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

نے حسرتِ گل گشت نہ پرواز کی طاقت   صدقے ہیں ترے کیا مجھے آزاد کرے گا

کعبہ و دیر میں حاتم بخدا غیرِ خدا   کوئی کافر نہ کوئی ہم نے مسلماں دیکھا

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم   کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی   کہ جسے سب کہیں وصال ہوا

فقیروں سے سُنا ہے ہم نے حاتم   مزا جینے کا مر جانے میں دیکھا ...

جس کو دیکھا سو یہاں دشمنِ جاں ہے اپنا　　دل کو جانے تھے ہم اپنا سو کہاں ہے اپنا

اس کے قدموں سے لگی رہتی ہے دن رات حنا
خوب دنیا میں بسر کرتی ہے اوقات حنا

ایک دن ہاتھ لگا یا تھا تیرے دامن کو
اب تلک سر ہے خجالت سے گریبان کے بیچ
ہاتھ مت کھینچ جنوں، تجکو میرے سر کی قسم
ایک جب تک بھی رہے تار گریبان کے بیچ

حاتم جہاں کو جان کے فانی خدا کو چاہ
اللہ بس ہے اور یہ باقی ہے سب ہوس

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک　　تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

زلفوں کے بل بتانا، آنکھیں چُرا کے چلنا
کیا کج ادائیاں ہیں، کیا کم نگاہیاں ہیں

تم تو بیٹھے ہوئے یہ آفت ہو　　اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
مُفلسی اور مزاج اے حاتم　　کیا قیامت کرے جو دولت ہو

اے خردمندو! مبارک ہو تمھیں فرزانگی
ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر
سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

میں ناتواں ہوا اس قدر، کہ مدت سے
نہ لب سے نالہ، نہ سینے سے آہ نکلے ہے
زبانِ خلق بھی حاتم عجب تماشا ہے
جدھر وہ نکلے، اُدھر واہ واہ نکلے ہے

لام نستعلیق کا ہے اُس بتِ کافر کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

ہر صبح اُٹھ بتوں سے مجھے رام رام ہے　　زاہد تری نماز کو میرا سلام ہے

کہتے ہیں سبھی مہرِ بتاں خوب نہیں ہے
سنتا ہی نہیں یہ دلِ گم راہ کسی کی

قائم

۱۷۲۲ — ۱۷۹۳ء

قیام الدین قائم چاند پور (ضلع بجنور، یو پی) کے رہنے والے تھے، ۱۷۲۲ء سے ۱۷۳۶ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ سنِ شعور کے پہنچتے ہی دہلی چلے آئے، شاہ عالم کے زمانے میں شاہی توپ خانے کے داروغہ ہو گئے۔ پہلے خواجہ میر درد سے اصلاح لی اس کے بعد سودا کی شاگردی اختیار کی۔

دہلی میں سیاسی ابتری پھیلی۔ دوسرے سخنوروں کے ساتھ ان کو بھی یہاں سے نکلنا پڑا۔ کچھ دن وطن میں رہے، پھر ٹانڈے پہنچے اور ایک امیر کی سرکار سے متوسل ہوئے تین ہی مہینے سکون سے گزرے تھے کہ عاقبت اور روزگار کی تلاش میں اُن کو رام پور اور لکھنؤ کا چکر لگانا پڑا۔ ۱۷۹۳ء (۱۲۰۸ھ) میں دوبارہ رام پور آئے اور یہیں انتقال کر گئے۔

قائم کی شاعری کی تمام تذکرہ نویسوں نے تعریف کی ہے۔ بہتوں نے میر اور مرزا کے بعد انھیں کو مانا ہے بعض ان کو سودا سے بھی بڑھ کر مانتے ہیں۔ خیر یہ تو زیادتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک باکمال شاعر تھے۔ تمام اصناف سخن میں کلام موجود ہے، ہجو اور فحش گوئی میں بھی اپنے استاد (سودا) کے ہم پلہ ہیں۔

کئی نظمیں قائم اور سودا کے کلیات میں مشترک پائی جاتی ہیں،

جو تحقیق کے بعد قائم ہی کی ثابت ہوئیں۔

انھوں نے دہلی کے قیام میں "مخزنِ نکات" کے نام سے اُردو شاعروں کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جو میر اور گردیزی کے بعد تیسرا مستند اور معیاری تذکرہ ہے۔

انتخاب

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

ایسی ہوا میں پاس نہ ساقی نہ جام ہے
رونا بجا ہے حال پہ تیرے سحاب کا

تھا گُلِ تازہ میں، پر حیف کہ بختِ بد سے
زینتِ گوشۂ دستارِ عزیزاں نہ ہوا

دے طولِ امل نہ وقتِ پیری
ہوئی صبح فسانہ مختصر کر

غربت میں مرا حال جو دیکھے ہے تو قاصد
زنہار نہ کہیو اسے یارانِ وطن میں

قائمؔ اس باغ میں بُلبل تو بہت ہیں لیکن
دل کِھلے ملنے سے جس کے وہ ہم آواز کہاں

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

جوں سرو رکھا سنگِ جفا سے مجھے آزاد مرہون ترا جی سے ہیں اے بے ثمری ہوں

ایک جا گہ پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں ہے عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں

میں کہا عہد کیا کیا تھا رات ہنس کے کہنے لگا کہ "یاد نہیں"

عاشق نہ تھا میں بلبل کچھ گل کے رنگ و بو کا
اک اُنس ہو گیا تھا، اس گلستاں سے مجھ کو

بھول کر بھی وہ نہیں یاد سے جاتا اپنی جان کر یاد سے جن نے کہ بھلایا مجھ کو

خشک و تر پھونکتی پھرتی ہے ہوا آتشِ عشق
بچیو اس آنچ سے اے پیر و جواں سنتے ہو

جوں موج مرا قافلہ غافل ہے سفر سے کیا جانے کہاں جائے گا آیا ہے کدھر سے
کس رات میں جوں گل نہ ہوا غرق لہو میں کس دن نہ بھری گود مری لختِ جگر سے
وہ خارِ نمی زدہ اس دشت میں میں ہوں پالا ہے جسے آبلے نے خونِ جگر سے

دم نہ دم تک بھی ہمارے ہی جہاں کی رونق
اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سنتے ہو

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھوں کے سو چلے
بلبلو خوش رہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ
گرچہ بلبل ہوں میں تاہم ولے اس باغ کے بیچ
فرق کوئی نہ کرے گل کو جہاں خار کے ساتھ

قسمت کہ وہ چارہ گر ہے اپنا جو زخم سے تار رفو نہ سمجھے
شایان چمن نہیں وہ بلبل ہر گل کا جو رنگ و بو نہ سمجھے
سمجھو گے ہمارے بعد ہم کو پر حیف کہ رو برو نہ سمجھے

قطعہ

انداز نگاہ رکھ سخن میں!
یعنی جو کہے ہے نیک کہہ تو!
دو گوش ترے ہیں اور زباں ایک!
تا دو نہ سنے نہ ایک کہہ تو!

اثرؔ

متوفّی ۹۵-۱۷۹۴ء

نام سید محمد۔ تخلص اثرؔ۔ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور ساری عمر اپنے بزرگوں کی ایک قابلِ عزت مثال بن کر اسی دیار میں بسر کردی۔ بھائی کو بھائی سے جو اُنس جیسی عقیدت اور جتنی ارادت تھی اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آئی ہیں۔

دردؔ کو اثرؔ پر جتنا اعتماد تھا اور اثرؔ کو دردؔ سے جو تعلق تھا اس کے ثبوت دونوں کے کلام میں جا بجا موجود ہیں ؎

دردؔ
تا قیامت نہیں مٹنے کے دلِ عالم سے
دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اثرؔ جاتے ہیں

اثرؔ
"دردؔ" ہی میرے جی میں چھایا ہے
"دردؔ" کا میرے سر پہ سایہ ہے

شاعری اور درویشی دونوں میں میر اثرؔ نے خواجہ دردؔ کو اپنا استاد اور مرشد قرار دیا ہے، اسی وجہ سے وہ ان کے وارث اور سجادہ نشیں ہوئے۔ توکل، استغنا اور فیض رسانی میں وہ تمام عمر اپنے بھائی اور سرپرست کے متبع اور مقلد رہے۔

اُردو شاعری میں میر اثرؔ دو حیثیتوں سے ممتاز اور قابلِ احترام

سمجھے جاتے ہیں ایک بحیثیت مثنوی نگار دوسرے بحیثیت غزل گو۔

اُن کی مثنوی "خواب وخیال" بقول مولوی عبدالحق "سلاست وفصاحت کی کان ہے" اور غزلوں میں سادگی وصفائی کے علاوہ درد واثر کا بھی خاصا سامان ہے۔

انتخاب

مثنوی خواب وخیال

کیا کہوں میں کسی سے اپنا حال — زیست کرنی غرض ہوئی ہے محال

کون کس کی سنے ہے کس سے کہوں — اور اُلٹے ہنسے ہے جس سے کہوں

درد کوئی کسو کا کیا جانے — اُس کا دل جانے یا خدا جانے

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا — چُپ رہوں تو رہا نہیں جاتا

پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا — تب تجھے ڈر کے ایک نظر دیکھا

تو جو ملنے سے جی چھپاتا ہے — آنکھ کھُل کر نہیں ملاتا ہے

خلق اس سے کچھ اور سمجھے ہے — ہاں برائی کے طور سمجھے ہے

میں جو تجھ سے دوچار ہوتا ہوں — پھر تو بے اختیار ہوتا ہوں

سارے منصوبے بھول جاتے ہیں — ہاتھ پاؤں اپنے پھول جاتے ہیں

بات کہنی تھی اور نکلی اور — بے حواسی کا ٹک ایک کرنا غور

جی میں کہتا ہوں کھا کے پچھتاوے — اب کے یہ یہ کہوں جو مل جاوے

بارہا اس کو آزمایا ہے — یہی حالِ خراب پایا ہے

ہجر میں جی ہے میرے پاس کہاں　　وصل میں گر جیا حواس کہاں

غزلیات

ہم عاصی گنہگاروں کو بس دونوں جہاں میں
صرف ایک ٹھکانا ہے ترے فضل و کرم کا

اللہ جانے آن پھنسا کیوں کہ دام میں
میں تو نہ تھا فریفتہ کچھ خطّ و خال کا

ہو جائیں گے جو راس کے معلوم　　داغوں کو مرے شمار کرنا

گر خانہ براندازیہ دلِ آہ نہ ہوتا　　رسوائے دو عالم کوئی واللہ نہ ہوتا
معلوم یہ ہوتا مزۂ جور و جفا سب　　اے شوخ اگر بندۂ درگاہ نہ ہوتا
جوں نقشِ قدم راہ میں پامال ہوا دل　　کوچے میں ترے کاش سرِ راہ نہ ہوتا

جانتا کچھ قدر ہماری بھی　　تو بھی عاشق اگر ہوا ہوتا
بے وفائی پہ تیری جی ہے فدا　　قہر ہوتا جو باوفا ہوتا

کبھو کرتے تھے مہربانی بھی　　آہ وہ بھی کوئی زمانہ تھا
کیا بتاؤں کہ اس چمن کے بیچ　　کہیں اپنا بھی آشیانہ تھا
ہوشیاروں سے مل کے جانو گے　　کہ آخر بھی کوئی دِوانہ تھا

بے طرح کچھ گھلا ہی جاتا ہے　　شمع کی طرح دل کو چور لگا

کہسار میں ہر سنگ یہ کہتا ہے پکارے　　اے درد منقر ہوں ترے نالوں کے اثر کا

جس کی خاطر سبھی ہوئے دشمن　　نہ ہوا وہ بھی دوست یا قسمت

تو ہی بہتر ہے آئینہ ہم سے　　ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں

کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ میں
ہیں سب وگرنہ یہ تیری باتیں نگاہ میں
ایسے کے خیر خواہ ہوئے ہم کہ جس کو آہ
بدخواہ میں ہے فرق نہ کچھ خیر خواہ میں

جان سے ہم تو ہاتھ دھو بیٹھے　　اس دلِ بے قرار کے ہاتھوں
روبرو دیکھنا محال ہوا　　دیدۂ اشک بار کے ہاتھوں
ایک عالم پڑا ہے گردش میں　　گردشِ روزگار کے ہاتھوں

یوں آگ میں سے بھاگ نکلنا نظر بچائے　　اپنے تئیں تو وضع نہ بھائی شرار کی
ہم سے شکستہ حال اسیروں کے روبرو　　ناحق خبر نہ لا کے سناؤ بہار کی

سوزؔ

۱۷۳۰ء ـــــ ۱۸۰۰ء

سید محمد میر سوزؔ۔ آباء و اجداد کا تعلق بخارا سے تھا۔ ان کی ولادت اور نشو و نما دہلی میں ہوئی۔ پہلے میرؔ تخلص کرتے تھے، لیکن میر تقی میرؔ کی شہرت اور شخصیت کا اندازہ کر کے سوزؔ اختیار کر لیا۔ خود بھی اس طرف ایک شاعرانہ اشارہ کر گئے ہیں ؎

کہتے تھے پہلے میرؔ میرؔ، تب نہ مُوے ہزار حیف
اب جو کہے ہیں سوزؔ سوزؔ، یعنی سدا جلا کرو

خوش طبع، متواضع اور مقبول لوگوں میں تھے، شاعری کے علاوہ خوش نویسی اور تیر اندازی میں بڑے ماہر اور مشاق، موسیقی سے آگاہ اور ایک اچھے شہ سوار تھے، شعر خوانی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ شعر اس طرح پڑھتے کہ سننے والے دم بخود ہو جاتے اور کبھی ان کے کمال اداکاری پر عش عش کرنے لگتے۔ ۱۷۷۱ء میں دلی کی تباہیوں سے متاثر یا اس کی خوش حالی سے مایوس ہو کر جب یہاں کے اہلِ کمال روزی اور سکون کی تلاش میں دوسری جگہوں کا رُخ کرنے لگے تو انھوں نے بھی فقیرانہ لباس پہنا اور لکھنؤ کی راہ لی۔ بیس سال تک جد و جہد کرنے کے بعد جب کوئی خاطر خواہ صورت نہ نکلی تو مرشد آباد پہنچے، وہاں

بھی قسمت نے یاوری نہ کی پھر لکھنؤ واپس آگئے۔ آصف الدولہ نے اپنا اُستاد مقرر کر لیا۔ سال ہی بھر تک بے فکری اور فراغت کی زندگی بسر کر پائے تھے کہ سفرِ آخرت کا وقت آگیا۔ لکھنؤ ہی میں مدفون ہوئے۔

شاعری کے بارے میں مولانا (محمد حسین) آزاد کی اس رائے سے اب تک کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے۔

"میر سوز مرحوم کی زبان عجب میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے"۔ ... "ان کے شعر کا قوام فقط محاورے کی چاشنی پر ہے، اضافت، تشبیہ، استعارہ، فارسی ترکیبیں ان کے کلام میں بہت کم ہیں، ان کے لحاظوں سے انھیں گویا اُردو غزل کا شیخ سعدی کہنا چاہیے۔ دیوان چھپ گیا ہے۔

انتخاب

چین آتا نہیں مجھے یا رب   دل پُر اضطراب ہوں کس کا

جن کو نت دیکھتے تھے اب ان کا   دیکھنا ہی خیال و خواب ہوا

کہاں میں اور کہاں اندیشۂ بوس و کنار اس کا
نہ بھائی! یہ خیالِ خام مجھ سے ہو نہیں سکتا

مت کرو دوستی مجھ سے کہ نہیں رہنے کا
میں مسافر ہوں کوئی دن کو چلا جاؤں گا

اہلِ ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

ابر کے قطرے سے ہو جاتے ہیں موتی ناصحا
کیا ہمیں رونے سے اپنے کچھ نہ حاصل ہوئے گا

خدایا کس کے بندے ہم کہاویں سخت مشکل ہے
رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعویٰ خدائی کا

اس سوا کھوج نہ پایا ترے دیوانے کا قطرۂ خوں ہے مگر خارِ بیاباں میں لگا

تمنا پیش کش، امید صدقے، آرزو قرباں!!
میں اپنے دل کی حسرت اپنے دل میں لے کے جاؤں گا

مروّت دشمنا! غفلت پناہا! ادھر بھی دیکھ لیجو مڑ کے آہا
کٹی اوقات سب لبلاں میں میری خداوندا! کریما! بادشاہا!!!
صرفت العمر فی لھوٍ ولعب فآہاً ثم آہاً ثم آہا!!!

بستیاں اُجڑی ہیں اور اُجڑے نگر آباد ہیں
وے کہاں جن کے جُدا ہونے سے ہم ناشاد ہیں

کس طرح روتے ہوا ے دیدۂ تر دیکھیں تو
کس طرح بہتے ہوا ے لختِ جگر دیکھیں تو
نوکِ مژگاں پہ تو آجاؤ جھمک کر پیارے
لختِ دل! آج تمھارا بھی ہُنر دیکھیں تو

آتا ہے وہ جفا جو، تیغ ستم کشیدہ ۔۔۔ دامن بدست چیدہ، ابرو بہم کشیدہ
صورت گر قضا نے، تجھ سا نہ کوئی کھینچا ۔۔۔ ہاں حُسنِ ماہ کھینچا، سو ہے قلم کشیدہ

جس گلشنِ جہاں میں کہ صبا دکا ہو خوف ۔۔۔ رہنا برنگِ بُلبُلِ تصویر شرط ہے

اشکِ خوں آنکھوں میں آکر جم گئے ۔۔۔ دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا ۔۔۔ پڑ گئی ہائے یہ کیسی مرے اللہ نئی

جوں خضر، ہوس عمرِ ابد کی نہیں مجھ کو ۔۔۔ اُس دم کی تمنا ہے جو تجھ پاس گزر جائے

قطعہ

ایک نے سوزؔ سے پوچھا کہ صنم سے اپنے
اب بھی ملتے ہو بدستور، کہ گاہے گاہے
دیکھ کر مُنہ کو گھڑی ایک میں بھر کر دم سرد
یوں اشارت سے جتایا "مُسر راہے گاہے"

شفیق

۱۷۴۵ء ——— ۱۸۰۰ء

لچھمی نرائن نام، فارسی میں تخلص صاحب تھا، اُردو میں شفیق۔ کھتری قوم سے تھے۔ اسلاف دراصل لاہور کے تھے۔ دکن میں اورنگ زیب کے لشکر کے ساتھ ان کے دادا آئے تھے اور یہیں اورنگ آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنی قابلیت اور فرض شناسی کی بدولت سرکار دکن میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور بڑی اچھی زندگی بسر کی۔ رائے منسارام (شفیق کے والد) سرکاری کاموں کی انجام دہی کے علاوہ تاریخ و انشا کا بھی ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا شغل تمام عمر جاری رہا۔

شفیق اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی جیسے جید عالم اور فن شعر کے ماہر سے اصلاح لی۔

ابتدائی دور میں تقریباً دو ہزار شعر کہہ کر دیوان مرتب کر لیا تھا مگر آزاد کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد اس کلام کو معیار سے کم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

شاعری کے علاوہ انھوں نے کئی تاریخی کتابیں لکھیں اور شاعروں کے تین تذکرے ترتیب دیے۔ بعض ان میں سے بہت بلندپایہ ہیں۔ اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام کم یاب ہے، اُردو کلیات اس بات پر شاہد ہے کہ وہ بڑے پُرگو تھے۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ غزلوں میں روانی ہے، مثنویوں میں زور اور قصیدوں میں جوش اور اہتمام پایا جاتا ہے۔ بزرگانِ اسلام سے خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ حضرت علیؑ غوث الاعظمؒ خواجہ بندہ نوازؒ کی شان میں جو قصیدے لکھے ہیں ان میں انتہائی ادب، منقبت اور احترام ملحوظ رکھا ہے۔ دکن کے نہایت ممتاز شعرا میں ان کا شمار ہے اور بقول مولوی عبدالحق مرحوم "اُردو کے اوسط درجے کے شعرا میں "شفیق" کا پایہ بہت بلند ہے۔"

انتخاب

شمع پہ پروانہ جل کر راکھ ہوا عاشقی کا نام روشن کر دیا

ان وفاؤں کا یہ بدلہ ہے جفا یا قسمت ہم چلے تم کو تو اب کرکے دعا یا قسمت

ہم ترستے ہی مریں لوٹے مزہ یوں پرویز کوہکن چیر کے سر کو یہ کہا یا قسمت

مہر اور لطف و تسلی ہو رقیبوں کے نصیب ہم پہ یہ جور و ستم اور بلا یا قسمت

قتل پر کس کے چلا ہے یہ ستم گار کہ بس

آستینوں کو چڑھا، کھینچ کے تلوار کہ بس

آخری دم ہے تک اک دیکھ مبتلا اے قاتل
بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس
حق تعالےٰ نہ کرے کس کو کسی پر مائل
ہم نے دیکھا ہے گرفتار ہو آزار کہ بس

بس ڈھکی رہنے دو یہ بات میاں مت بولو
ہم تمھیں دیکھ لیا اور تمھارا اخلاص

کم رکھے جی اپنے دل میں گُل رخاں کا اختلاط
جی ہی لے چھوڑے گا ورنہ ان بتاں کا اختلاط

مزاج گُل نپٹ نازک ہے اور مالی ہے بے پروا
چمن میں بُلبُلوں نے غل مچایا ہے خدا حافظ

ہمیں کنجِ چمن میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے
خدا جانے کہ ہم سے خوش ہو یا ناشاد جاتا ہے

مرے ہو خون کے پیاسے نہ چابو ہونٹ غصے سے
مبادا یہ عقیق اس تشنگی کو دور کر دیوے

اپنے بندوں پہ جان! دیکھو بھلا   کوئی اس طور ظلم کرتا ہے

ہر جہت بادِ صبا کے یہ قدم کا فیض ہے
مرقدِ بلبل پہ گل جو یوں چراغاں ہو گئے
جب کھلے بندوں گیا اور رسما تو باغ میں
تیری ایسی طرح پر سب گُل بھی خنداں ہو گئے

جرأت

متوفی ــــ ۱۸۰۹ء

شیخ قلندر بخش جرأت دہلی میں پیدا ہوئے، اُن کے والد حافظ امان ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے میں مارے گئے۔ بہت سے مشاہیر اور اساتذہ کے ساتھ ان کو بھی دہلی چھوڑنا پڑی۔ یہاں سے نکل کر فیض آباد میں مقیم ہوئے۔ عین جوانی میں چیچک نکلی اور بینائی سے محروم ہو گئے۔

شعر و سخن میں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ اس کے علاوہ نجوم اور موسیقی میں مہارت رکھتے تھے۔ ستار بھی اچھا بجاتے تھے۔

پہلے نواب محبت خاں کی سرکار میں ملازم ہوئے پھر مرزا سلیمان شکوہ کے درباری شعرا میں داخل ہو گئے۔ یار باش، بذلہ سنج اور ظریف دماغ لوگوں میں سے تھے۔ رنگین صحبتوں کے دلدادہ اور شعروں میں معاملہ بندی

کی طرف خاص رجحان رکھتے تھے۔

دیوان میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں، مخمس، واسوخت، ہجویں اور دو مثنویاں بھی ہیں۔ کلام میں سادگی، سلاست، شوخی، اور دلکشی پائی جاتی ہے لکھنؤ میں وفات پائی۔

انتخاب

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا
دن گیا رات ہوئی، رات گئی دن آیا

یہ وفا کی ہیں نے تس پر، مجھے کہتے بے وفا ہو
مری بندگی ہے صاحب، یہ ملا خطاب اُلٹا

اب ہم ہیں اور شامِ غریبی کی دید ہے
مدت سے وہ نظارۂ صبحِ وطن گیا

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا
بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

ہم اسیرانِ قفس کیا کہیں خاموش ہیں کیوں
راہ لے اپنی چل اے بادِ صبا تجھ کو کیا
لبِ ساغر سے ملامت لبِ گلگوں اپنا
غنچہ ساں رشک سے کب تک میں پیوں خوں اپنا

خجل ہوں باغباں سے میں نہالِ خشک ہوں ایسا
نہ بیٹھا کوئی سائے میں، نہ مجھ سے کچھ ثمر پایا

نمی جائے عیش و عشرت اب خاک بھی نہیں ہے
کوئی نگر کرے ہے برباد اس طرح کا

جہاں کچھ درد کا مذکور ہوگا ہمارا شعر بھی مشہور ہوگا

دل کو اے عشق سوئے زلفِ سیہ فام نہ بھیج
رہزنوں میں تو مسافر کو سرِ شام نہ بھیج

اس ڈھب سے کیا کیجے ملاقات کہیں اور
دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں کا داغ ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

دل تو اُمڈے ہے یہ حیرت سے میں روؤں کیونکر
ابرِ تصویر کو گریے سے سروکار نہیں

صیاد نہ کر منع کہ گلشن کی ہوس میں تڑپیں نہ یہ تو مرغِ گرفتار کیا کریں

اُس بن جہاں کچھ نظر آتا ہے اور ہی گویا وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں

دیکھیو یارب تو پھنسا دل کی گرفتاری ہیں موت کبھی آوے تو آوے اسی بیماری میں

رو کے میں پوچھا کہ مقصد جانتے ہو تم مرا
ہنس کے بولا میں کسی کے کام سے واقف نہیں

نالہ و آہ و فغاں بھی مرا دم بھرتے ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

وحشتِ عشق بری ہوتی ہے دیکھا ناداں
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کہ تو
ہم تو کہتے تھے نہ ہمراہ کسی کے لگ چل
اب بھلا ہم ہوئے رسوا سرِ بازار کہ تو

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو
دیکھنا زلف و رُخ تمھیں ہر وقت شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

دلِ وحشی کو خواہش ہے تمھارے در پہ آنے کی
دوانہ ہے وہ لیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

دیکھ مجھ کو اپنے در پر یوں کہا منہ پھیر کے
یہ دِوانہ کس لیے بیٹھا ہے رستہ گھیر کے

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

بلا جوڑے کی بندش اور قیامت قدِ بالا ہے
غضب چتون، ستم مکھڑا، بدن سانچے میں ڈھالا ہے

دیکھ زخمی مجھے اُس کوچۂ قاتل والے   ہنس کے کہتے ہیں کہ آ، زخمِ جگر سلوا لے

اب تو بازارِ محبت میں یہ ہے ہم پہ پکار
بیچتا ہے تو ادھر آ! ارے او دل والے

میر

۱۷۲۲ء —— ۱۸۱۰ء

خدائے سخن میر محمد تقی میر، والد کا نام محمد متقی جو ایک صاحبِ دل اور درویش صفت بزرگ تھے عمر کے دسویں ہی سال میں سید امان اللہ (میر متقی کے ایک غیر معمولی معتقد اور ارادت مند) کی ہمدردی اور تربیت، اور باپ کی شفقت دونوں سے محروم ہوگئے۔

اعزا یا خاندان والوں میں کوئی ایسا نہ ملا جسے یہ اپنا غم گسار یا سرپرست بنا سکتے، عاجز و مجبور ہو کر آگرہ چھوڑا اور دہلی آگئے۔ یہاں بھی خاطر خواہ معیشت و اطمینان کے وسائل گو محدود ہی رہے پھر بھی اس دیار میں رہ کر جو کچھ پڑھ لکھ سکتے تھے، پڑھا لکھا، شاعری شروع کی اور شہرت حاصل کی۔ یہی وجہ تھی کہ دلّی سے چلے جانے کے بعد بھی اس سرزمین سے وابستگی اور یہاں کی طرح طرح کی یادیں ان کے دل سے محو نہ ہو سکیں۔

میر نے استغنا اور درویشی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، بچپن ہی

یتیمی کا صدمہ برداشت کیا۔ متعلقین کی بے رُخی اور بے اعتنائیوں کا سامنا کیا۔ ترکِ وطن، اس کے بعد ہی سے نادر کی خون ریزیاں، ابدالی کی ہلاکت خیزیاں، جاٹوں کی لوٹ مار، روہیلوں کی یلغار، اس نوعیت کے مسلسل واقعات اور پیہم سانحے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان کے جبر کے اپنے دل پر سہے۔ گداز طبیعت اور درد مند دل کیوں کر اور کب تک ان تباہیوں اور ہلاکت آفرینیوں سے مغموم ومتاثر نہ ہوتا۔ یہی وہ صدمے اور حالات تھے جن کی بنا پر حزن اور ناامیدیاں اُن کی سیرت اور شخصیت میں رچ اور بس گئیں۔

میر کا سوز و الم اور ان کے کلام کی شہرت و قبولیت کوئی وقتی یا عارضی چیز بن کر نہیں رہی، وہ کیف اور کسک اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اردو زبان، اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے باقی ہیں۔ میر اپنی اس حیثیت اور مرتبے سے خود بھی واقف اور آگاہ تھے چنانچہ اپنے کلام میں جا بجا اس کا ذکر کیا ہے کہیں فخر کے لہجے میں کہیں مشورے کے طور پر اور کبھی تعلّی کے ساتھ۔ اور اب یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کیوں ایسا نہ کرتے جب کہ ان کی برتری یا عظمت کا اعتراف اور اظہار ناسخ، ذوق اور غالب سے لے کر آج تک تمام سخن ور اور اہلِ قلم کرتے چلے آرہے ہیں۔

غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونوں سے میر نے جی بھر کے مقابلہ کیا۔ غمِ دوراں تو اُن کی آنکھوں دیکھی سیاسی ابتری، انتشار اور طوائف الملوکی سے ظاہر ہے، اور غمِ جاناں کے ثبوت میں جنون کے دورے، مثنوی "خوابِ خیال" کلیات میں متعدد غزلیں اور بیسیوں شعر تیر و نشتر کی صورت میں موجود ہیں۔

اُردو میں واسوخت کی اصطلاح میر نے وضع کی تمام اصنافِ سخن

ین انھوں نے مشقِ سخن فرمائی ہے مگر اُن کے اصلی جوہر اُن کی غزلوں ہی
میں نمایاں ہیں یا پھر مثنویوں میں۔

اُردو کے چھ دیوان اور ایک فارسی دیوان (غیر مطبوعہ) کے علاوہ
انھوں نے (فارسی) نثر میں بھی تین کتابیں لکھی ہیں (۱) ذکرِ میر (آپ بیتی
جس سے اُس دور کے بعض سیاسی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے) (۲)
نکات الشعراء (اُردو شاعروں کا ایک قابلِ قدر تذکرہ) ۔ (۳) فیضِ میر
(بیٹے کی تعلیم و تربیت کی خاطر ایک رسالہ جس میں مفید اور سبق آموز
حکایتیں ہیں)۔

میر نے اپنی عمر کے دس سال آگرے میں گزارے، کم و بیش پچاس
سال دلّی میں رہے اور ساٹھ برس کی عمر سے آخر دم تک (تقریباً ۲۹، ۳۰
سال) لکھنؤ میں بسر کیے۔

لکھنؤ بھی میر صاحب اس طرح نہیں گئے جیسے اُن کے دوسرے ہم عصر
بلکہ نواب آصف الدولہ نے اُن کی تشریف آوری کا خاص اہتمام کیا۔
احترام کے ساتھ آئے اور عزّت کے ساتھ رہے۔ لکھنؤ کے عوام و خواص نے
بھی میر کے رتبے کا پاس اور اُن کی شاعری کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ آخر وقت
تک اس اعزاز اور قدر دانی میں فرق نہیں آیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ
نشانِ قبر کو امتدادِ زمانہ سے محفوظ نہ رکھ سکے۔

انتخاب

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ   مذہبِ عشق اختیار کیا

کہتے ہو تو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں   تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

گزرے ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی   ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

اے بوئے گل سمجھ کے مہکیو چمن کے بیچ
زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے بیچ

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر

مرگ اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میرؔ
جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنّت گئی جہنّم میں

مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں

ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا کام محبّت سے اُس آرام طلب کو

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے

میرے تغیّرِ حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے
دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھے بہانے کے

اک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ پہ عاشق
وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے میں رو دیا، تو لگا کہنے نہ کہہ میرؔ
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی زبانی

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی ہے

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم بادو باراں ہے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے!!
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

رباعی

بلبلؔ اُس شخص ہے جو آدم ہووے، ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گِرد آوے یک خلق خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

۱۸۱۸ء —— ۱۷۵۶-۵۸ء

سیّد انشاء اللہ خاں انشاؔ، ان کے بزرگ نجف اشرف سے آ کر دہلی میں آباد ہوئے۔ بعض تذکروں میں ہے وہ لوگ اصفہان سے آئے اور کشمیر میں مقیم ہو گئے۔ بہر حال اُن کے دادا ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے۔ انشاؔ کے والد حکیم ماشاء اللہ خاں مصدر اپنے وقت کے ایک حاذق طبیب، عالم فاضل، بہادر سپاہی اور خوش مذاق شاعر تھے۔ دہلی اور مرشد آباد دونوں جگہ انھوں نے اعزاز اور امارت کی زندگی بسر کی۔

انشاؔ نے اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت اور شعر گوئی میں مشورہ و اصلاح صرف اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ قدرت نے ان کو بلا کا ذہن، غضب کا دماغ، غیر معمولی طباعی، جدّت، شوخی اور ظرافت عطا کی تھی۔

دہلی کی ابتری کے زمانے میں ان کے والد مرشد آباد چلے گئے تھے، شاہ عالم کے دور میں انشاؔ دہلی آ گئے، اپنی لیاقت اور زبردست

حاضر دماغی اور ظریف الطبعی کی بدولت بڑے بڑے ادبی معرکے سر کیے۔ بادشاہ کے مزاج میں بہت جلد رسوخ حاصل کر لیا۔ کچھ دنوں بعد جب لکھنؤ پہنچے تو مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ اگرچہ انھوں نے شعر و ادب کی بعض محفلوں کو اچھا خاصا سوانگ اور ادبی اکھاڑا بنا دیا تھا پھر بھی ان کی ذہانت اور شرافت کا اتنا شہرہ ہوا کہ نواب وقت (سعادت علی خاں) کے مصاحب بن گئے۔ ان کا یہ عروج بالآخر زوال کا باعث بھی بن گیا۔ نواب طبیعتاً ایک سنجیدہ اور منتظم قسم کے آدمی۔ یہ اس کے بالکل برعکس۔ ان کی حد سے بڑھی شوخیاں آخر رنگ لائیں۔ نواب کسی بات پر ناخوش ہو گئے خانہ نشینی کا حکم مل گیا اور پھر عمر کے آخری دن فراغت اور سکون کے بجائے بے کیفی اور مجبوریوں کی نذر ہوئے۔

انشا نے اپنی جودتِ طبع سے کام لے کر اردو شاعری میں طرح طرح کے تجربے کیے ہیں شعروں میں کیفیت کم اور مشاقی زیادہ ہے۔ سنگلاخ زمینیں، مشکل اور طویل بحریں، عجیب و غریب قافیے، ہر طرز میں تنوع کی کوشش، ہر موضوع میں ظرافت کی آمیزش یہی چیزیں ایک وصف یا ہنر بن سکتی تھیں بشرطیکہ ان میں استقلال اور اعتدال ہوتا پھر بھی اُن کے یہاں بہت سے ایسے لطیف اور بلند پایہ شعر ہیں جن کو پڑھ کر اُن کی تمام بے اعتدالیاں بھول جاتی ہیں۔

نظم کے علاوہ انشا کے دو نثری کارنامے بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ دریائے لطافت کی تالیف اور رانی کیتکی کی کہانی۔ پہلی کتاب میں پہلی بار ایک اردو شاعر نے زبان کے لکھنے بولنے اور برتنے کے

اصول وقواعد مرتب کیے ہیں اور دوسری کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ایک لفظ بھی فارسی یا عربی کا نہیں آنے دیا ہے، عربی فارسی اور اُردو کے علاوہ انشاؔ - ترکی، پشتو، پوربی، پنجابی، مارواڑی، مرہٹی، کشمیری اور ہندی سے بھی واقف تھے۔

کلیات میں غزلیں، قصائد (اُردو فارسی) مثنویاں، ہجویں، رباعیات، معمے، پہیلیاں، ریختی کا دیوان اور متعدد اصناف میں بے نقط اشعار کا ایک چھوٹا سا دیوان، غرض یہ سب کچھ موجود ہے۔

انتخاب

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا

نزاکت اُس کے یہ ٹکڑے کی دیکھیو انشاؔ
نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

رکھتے ہیں کہیں پاؤں تو پڑتے ہیں کہیں اور
ساقی تو ذرا ہاتھ تو لے تھام ہمارا

رانوں کو نہ نکلا کر دروازے سے باہر
شوخی میں دھر دیا پاؤں نہ اندازے سے باہر

میں اور زیرکِ عشق بھلا کچھ بھی ربط ہے
اے مہرباں، غلط غلط، اے قدرداں غلط

آوارہ گردِ شوق میں مانندِ گردِ باد
بھٹکا پھروں ہوں کر کے رہِ کارواں غلط

جس زمیں پر ہوں ترے کشتۂ دیدار کے پھول
کیوں نہ پھر واں سے اگیں نرگسِ بیمار کے پھول

تا لبِ بام قفس اڑ نہ سکے ہم صیاد اب تو پہنچا ہے یہ بے بال و پری کا عالم

ادا و ناز و حجاب و غمزہ، کرشمہ، شوخی، حیا، تغافل
تمھاری چتون کے آگے آگے یہ کرتے ہیں اہتمام آٹھوں
شکیب و صبر و قرار و طاقت، نشاط و آرام و عیش و راحت
تمھاری الفت میں کھوئے بیٹھا ہوں میں یہ لا کلام آٹھوں

یہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے ان دنوں پہروں
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے سنا انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گر یار مے پلا دے تو کیوں کر نہ پیجیے! زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

بڑی داڑھیوں پہ نہ جا دلا! یہ سب آہوؤں کے ہیں مبتلا
یہ شکار کھیلیں ہیں برملا انھیں ٹٹیوں کی تو آڑ میں

کل وہ بولا مجھ سے ہنس کر، چاہ ارے کچھ کھیل نہیں
میں ہوں ہنس جوڑا اور تو ہے منقطع میرا تیرا میل نہیں
حسرت و حرماں یاس و تمنّا، دردِ فراق و رنج و تعب
اپنے سر پہ اتنی بلائیں ناحق اے دل جھیل نہیں

گر نازنیں کے کہنے سے مانا بُرا ہو کچھ
میری طرف کو دیکھیو میں نازنیں سہی

چھیڑنے کا تو مزا تب ہے کہو اور سنو!
بات میں تم تو خفا ہو گئے، لو اور سُنو

اس سے کہہ دو کہ نہ بھیجا کرے لکھ لکھ کے ہمیں
مجھے بدنام کرے گا یہ نگوڑا کاغذ

تو فقیروں کی دعا ہر طرح آباد رہو
خوش رہو، چین کرو، تازے رہو، شاد رہو

یارب لگائی آگ ہو جس نے یہ بیر کی
پانی کی دیگ میں اسے لے کر اُبال ڈال

چند مدت کو فراقِ صنم و دیر تو ہے
چلیے پھر کعبے بھی ہو آویں بھلا سیر تو ہے

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

گالی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی
یہ سب سہی، پہ ایک نہیں کی نہیں سہی

راسخ

۱۷۴۸ء ——— ۱۸۲۲ء

شیخ غلام علی نام، راسخ تخلص، مولد و مدفن عظیم آباد (پٹنہ، بہار)
پہلے عشق (معاصر میر و سودا) اور سترر کو کلام دکھایا، اس کے بعد
میر کے ایسے قائل اور گرویدہ ہوئے کہ دہلی جا کر ان سے ملے۔ بغرض
اصلاح اپنا دیوان پیش کیا، میر صاحب نے جستہ جستہ اُسے دیکھ کر فرمایا "تم
سمجھے بوجھے آدمی ہو، تم کو اصلاح کی کیا ضرورت"۔ شیخ صاحب
نے پھر اصرار کیا تو دو چار جگہ قلم لگا کر اپنا دیوان عنایت کر کے بولے
"یہی تمھاری اصلاح کیا کرے گا"۔ اس عزت افزائی پر راسخ زندگی
بھر نازاں رہے اور میر سے اپنی وابستگی اور تعلق کا متعدد مقطعوں
میں اظہار کیا ہے۔

تقریباً ساٹھ برس کی عمر تک کلکتے، غازی پور، لکھنؤ اور دہلی کی
سیاحت کے بعد وطن آ کر مقیم ہو گئے۔ عظیم آباد ان دنوں ارباب کمال
کا مرجع، سخن وروں اور سخن شناسوں کا مرکز تھا۔ راسخ کو فضا سازگار
آئی پھر مرتے دم تک کہیں جانے کا سوال ہی نہ رہا۔

راسخ ایک صوفی منش اور آزاد و مرشتہ انسان تھے، بے نیازی
کا یہ عالم کہ ساری زندگی کرائے کے مکان میں رہے، بزرگانِ دین سے

خاص عقیدت تھی، اکثر ان کے مزارات پر جا کر اپنا کلام پڑھا کرتے تھے۔ موسیقی سے بھی لگاؤ تھا، مشہور ہے کہ جب تک سُروں سے دل گداز نہ ہو جاتا شعر نہ کہتے۔ مشاعروں میں دو زانوں ہو کر بیٹھتے اور آنکھیں بند کیے جھوما کرتے، شعر خوانی کے درمیان واہ واہ کرنا مشاعرے کے آداب کے خلاف سمجھتے، مشاعرہ ختم ہو جاتا تب شعرا کی ہمت افزائی کرتے اور داد و تحسین کے کلمات سے نوازتے۔ اپنی غزل سُناتے وقت آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا، چار پانچ شعر سے زیادہ نہ پڑھ سکتے۔

۱۸۹۳ء میں پٹنے سے کلیات شائع ہوا تھا، تمام اصنافِ سخن میں کلام موجود ہے، مثنوی کی زبان میر کی سی ہے، غزلوں میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے، زبان صاف اور سادہ ہے، مضامین پاکیزہ اور طرزِ بیان سلیس ہے۔

انتخاب

شاگرد ہیں ہم میرؔ سے استاد کے راسخؔ　　استادوں کا استاد ہے، استاد ہمارا

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ
کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چُبھا ہوا

دُکھ سہے ترکِ جو نظارۂ دل دار کیا
آہ یہ ہجر نے دونا ہمیں بیمار کیا!

جوانی ہنس کے کاٹی اب پلک پر اشک چمکے ہے
جو رات آخر ہوئی نکلا ستارہ صبح پیری کا

تھا جی میں کہ بہ شب ہائے ہجر اُس سے کہیں گے
پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا

سونپا ہوا داغ ان کا تازہ ہی سدا رکھا
ہم نے بھی امانت کو چھاتی سے لگا رکھا

دور میں اس کی مست آنکھوں کے
محتسب بھی شراب خوار ہوا

راسخ کو ہے میر سے تلمذ
یہ فیض ہے ان کی تربیت کا

صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھ کر
قاصد نے اُن کے آنے کی دل سے بنائی بات

اپنا بھی ماجرائے دل اک مرثیہ سا ہے
بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر

شیخ اس بُت شکنی پر نہ ہو نازاں اتنا
تو نے توڑا نہیں اپنا بُتِ پندار ہنوز

بازارِ جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا
لے جائیے کہاں اب تجھے اے جنسِ وفا ہم

گھر سے کھو کر در پہ اپنے بیٹھنے دیتے نہیں
تم جو کہتے ہو کہ جا یاں سے میں اب جاؤں کہاں

تکتا ہوں ان کے حسرتِ پابوس میں جو ہاتھ
کہتے ہیں بیٹھے ہاتھ تم اپنے مَلا کرو
راسخ علاقہ دل کا نہ ہو دلبروں کے ساتھ
تم اہلِ دل ہو حق میں مرے یہ دُعا کرو

اگر بابِ اجابت تک رسا اپنی دُعا ہوتی
تو جی میں تھا کہ خواہانِ دلِ بے مدعا ہوتا

آہ عالم کی ہم اس وضع سے حیران ہوئے
دشت یاں شہر ہوئے شہر بیابان ہوئے

وقتِ چلنے کے علاقوں کی خلش تا نہ رہے
اس لیے جی کو ہر اک شے سے اٹھایا ہم نے
خواہشیں جمع تھیں دل میں، سو کیا ان کو وداع
کوچ سے آگے ہی سامان لٹایا ہم نے

صبح سے ہے بے تابی جی کو، آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھیے کیا ہو شام تلک، جی آج بہت گھبراتا ہے

مصحفی

۱۷۴۷ ——— ۱۸۲۴ء

غلام ہمدانی نام، مصحفی تخلص، اکبر پور (از مضافات دہلی) میں پیدا ہوئے حکومت میں "تفرقہ" رونما ہوا تو ان کے بزرگ امروہہ میں جا کر آباد ہو گئے۔ وہیں ان کا بچپن گزرا اور تعلیم کی ابتدا ہوئی بارہ تیرہ سال کی عمر میں دہلی آئے۔ تعلیم مکمل کی اور شاعر کی حیثیت سے مشہور ہونے لگے۔ معاش کی خاطر اُن کو آنولہ، ٹانڈہ اور لکھنؤ کے چکر لگانے پڑے۔ دہلی، یہاں کی سرزمین اور بود و باش بے حد عزیز تھی۔ چنانچہ پہلی بار لکھنؤ پہنچے تو وہاں دل نہ لگا۔ دہلی واپس آ گئے مگر حالات اتنے ناسازگار تھے کہ یہاں رہ نہ سکے اور دوبارہ لکھنؤ جانا پڑا۔ سید انشا کے ذریعے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ جلد ہی رسوخ اور مراسم حاصل کر لیے۔ سید انشا ہی سے معرکہ آرائیاں شروع ہو گئیں اور پھر وہاں سے ملول و متأسف ہو کر الگ ہو گئے۔ مصحفی اپنے علم، اخلاق، انسانیت اور شاعرانہ کمالات کی بنا پر ایک بڑے قابلِ تعظیم بزرگ تھے۔ اُردو شاعری کا عروج اور اس کا نہایت روشن دور انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حاتم سے لے کر شاہ نصیر تک سے ان کی ذاتی ملاقات تھی۔ میر، سودا، درد اور مرزا مظہر جیسے اکابرین کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا ان کو شرف حاصل رہا۔ قائم، جرأت

سوزؔ، انشاؔ اور میر حسنؔ جیسے بلند پایہ سخن وروں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے، آتشؔ، خلیقؔ، ضمیرؔ اور اسیرؔ ان کے قابلِ فخر شاگردوں میں سے تھے۔

اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور ہمہ گیر طبیعت کی مناسبت سے کسی ایک رنگ پر قناعت نہیں کی۔ قدما اور معاصرین کے کلام کے جو بہترین اسلوب اور نمونے ہو سکتے ہیں، وہ سب ان کے یہاں موجود ہیں بقول مولانا حسرت موہانی مرحوم "میرؔ اور مرزاؔ کے بعد کوئی استاد ان (مصحفیؔ) کے مقابلے میں نہیں جچتا۔" دو دیوان فارسی کے، آٹھ اردو کے منتعدد قصائد اور مثنویاں ان کے نام کو روشن رکھنے کے لیے اب بھی باقی ہیں۔ اس کے علاوہ شاعروں کے تین تذکرے (عقد ثریا، تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا) بھی انھوں نے ترتیب دیے تھے۔ جو ان کی بہت بڑی یادگار ہیں۔ اتنے اوصاف کے حامل اور با کمال ہونے کے باوجود فراغت اور اطمینان کی زندگی نہ بسر کر پائے۔ تقریباً اسّی برس کی عمر میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

انتخاب

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا
یاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا

بندہ ہے ترا، مصحفیِؔ خستہ کو یا رب
محتاج طبیبوں کی نہ رکھ چارہ گری کا

مجھے اشکوں میں یوں لختِ جگر بہتے نظر آئے
کہ جیسے وقتِ شب دریا میں ہو عالم چراغاں کا

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

مجھے آتا ہے رحم اس طائرِ بے پر کی حسرت پر
کہ اُڑ سکتا نہیں، اور ہے قریبِ آشیاں بیٹھا

ترے کوچے اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

ہیں عجب یہ رسم دیکھی کہ بروزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

اُس گُل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات غنچے نے مسکرا کے کہا، میں نے پائی بات

دیکھا تھا ایک دن کہیں اُس گُل کو باغ میں
آوارہ پھر رہی ہے چمن میں ہوا ہنوز

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم عالم کے میاں خانہ بر انداز ہوئے تم

ہم تو اس کوچے میں گھبرا کے چلے آتے ہیں
دو قدم جاتے ہیں، پھر جا کے چلے آتے ہیں
وہ جو ملتا نہیں، ہم اُس کی گلی میں دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

کیا جانیے کیا حال ہوا صُبح کو اُس کا
ڈھلکی ہوئی تھی شب ترے رنجور کی گردن

جس طرح ہو کسی دریا میں چراغاں کی بہار
یوں چمکتے ہیں مرے دیدۂ تر پانی میں
جامۂ شبنم کا وہ پہنے تو بدن یوں جھلکے
شوخیاں جیسی کرے عکسِ قمر پانی میں

کیا مصیبت ہے کھلے آنکھ تو رونا آئے
اور جھپکے تو وہی خوابِ پریشاں دیکھوں

میں وہ بے کس ہوں کہ مانندِ چراغِ سرِ راہ
مر بھی جاؤں تو کوئی آ کے نہ روئے مجھ کو
اس قدر چشمِ خلائق میں سُبک ہوں کہ اگر
ڈوبنے جاؤں تو دریا نہ ڈبوئے مجھ کو

نہ نسیم نامہ بر ہو، نہ صبا پیام بر ہو　　تجھے کس طرح سے یا رب، مرے حال کی خبر ہو

کارواں دور گیا، پاؤں تھکے، جی ہارا　　کون اب منزلِ مقصود کو پہنچائے مجھے

حسرت یہ اس مسافرِ بے کس کی رو ئیے　　جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے

کبھی در کو تک کے کھڑے رہے، کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی، تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے
نہ انیس ہے، نہ جلیس ہے، نہ شفیق ہے، نہ رفیق ہے
ہم اکیلے گھر میں پڑے رہے، سبھی لوگ گھر کے چلے گئے

ہم تو سمجھے تھے کہ آثارِ جنوں دور ہوئے
تازہ اس فصل میں زخموں کے پھر انگور ہوئے

کیا جانیے اکسیر ہے، عنقا ہے یہ کیا ہے　　ملتی نہیں جو چیز زمانے میں وفا ہے

رونے پہ مرے جو ہنس رہے ہو　　یہ کون سی بات ہے ہنسی کی

رہی جہان میں جب تک کہ ہم خراب رہے　　مدد فلک کی، نہ طالع کی یاوری دیکھی

اسیر بلا پھر یہ ہوتا ہے کیوں　　جو بندے کے ہر دم خدا ساتھ ہے

٭٭٭

نظیر

۱۷۳۵ —— ۱۸۳۰ء

نام ولی محمد، تخلص نظیرؔ۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے ماں باپ کی تیرھویں اور آخری اولاد تھے جسے زندگی نصیب ہوئی۔ بچپن لاڈ پیار اور جوانی آزادی اور بے فکری سے گزاری۔ احمد شاہ ابدالی کے متواتر حملوں سے جب دہلی میں رہنا مشکل ہو گیا تو اپنی نانی اور ماں کو لے کر اکبر آباد (آگرہ) چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

اُردو فارسی کے علاوہ عربی، بھاشا، پوربی، پنجابی اور ہندی اس حد تک جانتے تھے کہ ان زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ خوش نویس تھے، سپہ گری سے واقف تھے، علم ہیئت پر عبور تھا، طب میں دخل تھا، معانی اور بیان میں اچھی معلومات تھی۔ شاعری کا چسکا دہلی ہی سے لگ چکا تھا۔ اس میدان میں بھی اپنے بزرگوں ہم عصروں اور بعد کے آنے والوں سے الگ راہ اختیار کی۔ عام انسان کی خواہشات، ضرورتیں، مشغلے، تفریحیں، رسم و رواج، تیوہار، عقیدے، گرد و پیش کی اچھی بُری دلچسپیاں چرند، پرند، کھیل تماشے، روٹی، روزگار، پیسہ کوڑی، بچپن، جوانی اور بڑھاپا یہ تھے وہ موضوع اور عنوانات جن پر نظیرؔ نے جی کھول کر شعر کہے ہیں۔ ان کی نظموں میں مسرت، موعظت اور عبرت، تفکر، تمسخر

اور فلسفہ سب کچھ موجود ہے۔

نظیر کی بدولت اُردو میں نئی نئی بندشوں، تشبیہوں اور استعاروں کا اضافہ ہوا ہے۔ معشوق کو مذکر لکھنے کی روایت کو سب سے پہلے اسی شاعر نے توڑا ہے۔ قومی یک جہتی کا محرک اور علم بردار جدید اور نیچرل شاعری کا موجد اور نقیب کہلانے کا صحیح معنوں میں مستحق ہے۔ الفاظ کے ایک غیر مختتم خزانے کا مالک تھا۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم "شاعری کے متعلق اس کے دو رجحان تھے' ایک نغمہ دوسرے اظہار نظر اس لیے وہ لوگ جو شاعری میں ان دو چیزوں کے متلاشی ہیں وہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور جو لفظوں کے گورکھ دھندوں میں پھنسے ہوئے ہیں وہ ان کے کلام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں" ____ پرانے تذکرہ نگاروں کی بے اعتنائیوں کے باوجود بیسویں صدی کا نقاد اور سخن سنج اس بات کا بڑے فخر اور اعتماد کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ "........ اپنے رنگ میں نظیر فرد فرید اور یکتائے روز گار ہے"!

(فرحت اللہ بیگ)

عصبیت اور تنگ نظری سے اپنا دامن پاک رکھا۔ دولت اور مراتب کو جی کا جنجال سمجھتے تھے' سائل کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے تھے نہ کسی فرد کی ہجو کی اور نہ کسی امیر کی شان میں قصیدہ لکھا، تھوڑی سی تنخواہ اور بلاس رائے کے لڑکوں کو پڑھانے میں عمر کے بہت سے دن گزار دیے۔ زندگی بھر مقبول اور ہر دل عزیز رہے۔ جب مرے ہیں تو مختلف مذہب اور فرقے کے لوگوں نے ان کو اپنا ہی سمجھ کر انتہائی عقیدت اور گہرے تعلق کا اظہار کیا۔ شہر آشوب، پیسہ، مفلسی، خوشامد

روٹی اور آدمی نامہ۔ ان کے علاوہ اور بہت سی بے مثل نظمیں ان کے کلام کو زندہ اور تابندہ رکھیں گی۔ انتخاب میں صرف غزلوں کے شعر دیے جارہے ہیں تاکہ اس صنف میں بھی نظیر کے کمالات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

انتخاب

کہتے ہیں جس کو نظیر سنیئے ٹک اس کا بیاں
تھا وہ معلم غریب، بزدل و ترسندہ جاں
شعر و غزل کے سوا شوق نہ تھا کچھ اسے
اپنے اسی شغل میں رہتا تھا خوش ہر زماں
سُست روش، پست قد، سانولا، ہندی نژاد
تن بھی کچھ ایسا ہی تھا، قد کے موافق عیاں
وضع سُبک اُس کی تھی، تپیہ نہ رکھتا تھا ریش
مونچھیں تھیں اور کانوں پر پٹے بھی تھے پنبہ ساں
جتنے غرض کام ہیں اور پڑھانے سوا
چاہیے کچھ اس سے ہوں اتنی لیاقت کہاں
فضل نے اللہ کے اس کو دیا عمر بھر
عزت و حرمت کے ساتھ پارچہ و آب و ناں

لگی تھی آگ جگر میں بجھائی اشکوں نے
اگر یہ اشک نہ ہوتے تو، کیا ٹھکانا تھا

کہنے اس شوخ سے دل کا جو میں احوال گیا
واں نہ تفصیل گئی پیش نہ اجمال گیا

نہ گُل اپنا، نہ خار اپنا، نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

تھا ارادہ تری فریاد کریں حاکم سے
وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا

مت شفق کہہ یہ ترا خون فلک پر ہے نظیر
دیکھ ٹپکا تھا کہاں اور کہاں جا نکلا

صحرا میں مرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا
گر پھوٹ کے رویا تو مرے پاؤں کا چھالا

دل سا دُرِ یتیم بکا کوڑیوں کے مول
کیا کیجیے خیر یہ بھی خریدار کے نصیب

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

بحرِ ہستی میں صورت احباب
یوں ہی جیسے بروئے آب حباب

قسمت میں گر ہماری یہ مے ہے تو ساقیا
بے اختیار آپ سے شیشہ کرے گا جست

عزت و قدر کی اُس گُل سے توقع ہے عبث
واں نہ عزت کی کچھ عزت ہے نہ کچھ قدر کی قدر

بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہے کاتبِ تقدیر کوئی اور

چراغِ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ
یہ بزم تم کو مبارک ہو ہم تو چلتے ہیں

یوں کھول کے رخسار یہ کاکُل سرِ محفل
غافل نظرِ بد سے مری جان نہ بیٹھو

جُدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو
یہ داغ وہ ہے جو دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

کچھ تماشے جنوں کے بھی دیکھو
گرہ دیوانے کو تم نے چھیڑا ہے

ناز اُٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں لیکن
لطف بھی ایسا اُٹھایا ہے کہ جی جانے ہے

ایّام شباب اپنے بھی کیا عیش اثر تھے
کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اس وقت ہنر تھے

دل زلف میں رکھتے ہو تو اکتانے نہ پائے
یہ صید نیا ہے ابھی گھبرانے نہ پائے

کیوں کر نہ چمن میں تری قامت پہ فدا ہو
ہر سرو اسی چاؤ میں نکلا ہے زمیں سے

مُنہ زرد، آہِ سرد، لبِ خشک و چشم تر
سچّی جو دل لگی ہے تو کیا کیا گواہ ہے

رنگین

۱۷۵۵ء ---- ۱۸۳۵ء

نام سعادت یار خاں، تخلص رنگین، ان کے والد طہماسپ بیگ توران کے رہنے والے تھے، نادر شاہ کی فوج کے ساتھ اپنے کسی عزیز کے ہم راہ ہندوستان آئے تھے، دہلی میں مقیم ہو گئے۔ امن اور جنگ کے موقعوں پر مختلف قسم کی خدمات کی انجام دہی کے سلسلے میں خطاب، عزت شہرت اور خاطر خواہ دولت حاصل کی، رنگین کا نہ صرف بچپن بلکہ عمر کا زیادہ حصہ نہایت فراغت اور عیش و عشرت میں بسر ہوا۔ سپہ گری کا فن اور ان کے رموز ابتدائی عمر میں اپنے والد سے سیکھ لیے تھے۔ پندرہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا، شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ معرکہ آرائی، سیاحت، ملازمت، تجارت اور مصاحبت غرض زندگی کے ہر دور میں شاعری سے ضرور واسطہ رکھا۔ ساٹھ پینسٹھ سال کی مدت میں ہزاروں شعر کہے ہوں گے، غزل اور مثنوی کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن میں بھی کلام موجود ہے۔ اردو میں ریختی کے موجد ہیں اور یہی ایجاد ان کی بدنامی کا باعث بھی بن گئی۔ نظم و نثر ملا کر ۳۲ کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی، پنجابی، برج بھاشا، گجراتی، مرہٹی، پشتو، عربی، اور ترکی سے بھی واقف تھے۔ ان میں سے کئی

زبانوں میں اُن کی نظمیں موجود ہیں۔

رنگین نے اپنے حالات، محسوسات، مشاہدے اور زندگی میں پیش آنے والے بہت سے واقعات اور تجربے جن میں اچھی بری دونوں طرح کی باتیں ہیں، خود ہی قلم بند کر دی ہیں اور وہ سرمایہ آج بھی محفوظ ہے۔ مگر اس کا بہت کم حصّہ شائع ہو کر لوگوں کے سامنے آسکا ہے۔ ان کے پورے ادبی سرمائے کا جائزہ لینے کے بعد پھر ان کو ایک بدنام شاعر کہنا اور ناقابلِ التفات شخصیت قرار دینا مناسب نہ ہوگا۔

انتخاب

کیا بے کسی کا وقت ہے عشقِ بتاں میں آج
رنگینؔ، نہیں ترا کوئی اللہ کے سوا

پھر لگا آنے مجھے دھیان اُس کی چشمِ مست کا
پھر میں بے خود ہو کے صحرا کی طرف جانے لگا

جی بیچ کے یہ عشق کا جنجال خریدا اس جنس کو کھو ہم نے عجب مال خریدا

تا حشر رہے یہ داغ دل کا یارب نہ بجھے چراغ دل کا

چشمِ گریاں، سینہ بریاں، آہ سرد و رنگ زرد
عشق میں کیا اِس سوا کچھ اور حاصل ہوئے گا

خاک کو باغ میں چھانے گی صبا میرے بعد   پر کھلیں گے نہ ترے بند قبا میرے بعد
غم نہیں مرنے کا اپنے مجھے یہ سوچ ہے آہ   کون اٹھاوے گا ترے جور و جفا میرے بعد
میں تو ناکام گیا پر یہ دعا ہے میری   دے محبت کو نہ تاثیر خدا میرے بعد
تو نے پامال جو رنگیں تم کو کیا اس نے کہا   رنگ ایسا نہیں دینے کی حنا میرے بعد

دیوانہ ترا دونوں عالم سے نہیں واقف   شادی سے نہیں محرم، ماتم سے نہیں واقف

دو چند ظلم کیا تب سے دردمندوں پہ
فلک نے جب سے تری کج ادائیاں دیکھیں
بتاں کے عشق میں اس بخت بد نے اے رنگیں
مشقتیں مجھے جو جو دکھائیاں دیکھیں

سو بار کہا آئیں گے اور آئے نہ ہرگز   بد عہد ہو تم ہم تمھیں پہچان چکے ہیں

نرگس کو وہ چمن میں کیا بھر نگاہ دیکھے   وہ انکھڑیاں نشیلی جب کو خوش آئیاں ہوں

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے
جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

گو فصلِ بہار آوے رہائی کے لیے ہم — ہرگز نہ کبھی منتِ صیاد کریں گے

صیاد پہنچوں کیوں کہ چمن تک کہ تو نے آہ
چھوڑا نفس سے توڑ کے ہے بال و پر مجھے

دل ہو خوں اور حنا کو بھاگ لگے — اس تری منصفی کو آگ لگے

نہ رہا میرے پاس پر نہ رہا — دل کی ہر چند کی نگہبانی

بھلا کرنے آئے بُرا کر چلے — ہم آئے تجھے کیا کرنے کیا کر چلے

۱۷۷۱-۱۷۷۲ء — ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش ناسخ۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے، لکھنؤ کو اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ ساری عمر یہیں رہے اسی شہر میں وفات پائی اور مدفون ہوئے۔ مشہور ہے کہ لاہور کے ایک متمول تاجر خدا بخش خیمہ دوز نے ان کو متبنی کر لیا تھا۔ لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری اور ورزش یہی دو ان کے مرغوب ترین مشغلے تھے۔ عمر اور وقت کا زیادہ حصہ بس انہیں دونوں کاموں میں صرف کیا ———

کہتے ہیں کہ شاعری میں میر تقی میر کی شاگردی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

ذاتی کوشش اور کاوش سے فن شاعری میں اتنی مشق اور مہارت حاصل کرلی تھی کہ اپنے وقت کے مستند استاد تسلیم کیے جاتے ہیں مخصوص انداز سخن کی بنا پر لکھنؤ اسکول کے ایک طرزِ خاص کے موجد کہلاتے ہیں۔ شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ ان کے گرد قائم ہوگیا تھا۔ وزیر، برق، رشک، منیر اور آباد وغیرہ ان کے مشہور تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔

قدما کے کلام میں جو نامہذب اور فحش الفاظ پائے جاتے ہیں ناسخ نے ان کو زبان سے خارج کیا۔ ہندی لفظوں کو الگ کرکے عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کو رائج اور مستعمل کیا۔ تذکیر و تانیث کے قواعد مقرر کیے۔ ریختہ کے بجائے اردو کا لفظ استعمال کیا، آئے ہے، جائے ہے کی جگہ آتا ہے جاتا ہے لکھنا شروع کیا، دکھائیاں، بتائیاں اور اسی طرح کے لفظوں کو متروک قرار دیا، مختلف مضامین اور خیالات پر طبع آزمائی کرکے غزل کا دائرہ وسیع کیا۔ ان اصولوں اور قواعد پر اتنی سختی سے پابندی کی کہ ان کی غزلیں ثقیل دار اور دقیق الفاظ کا مجموعہ بن گئیں۔ اشعار میں طرح طرح کی تشبیہیں اور رعایتیں بہ کثرت نظر آنے لگیں مگر کیف اور اثر سے بیشتر کلام خالی رہ گیا۔

ناسخ ایک پہلوان صفت، خوش خور، خوددار، باوضع، رکھ رکھاؤ اور میل ملاقات کے معاملے میں بعض اصولوں پر سختی سے کاربند

رہنے والے لوگوں میں سے نہ کبھی کسی کی شان میں قصیدہ نہیں لکھا اور والیانِ ریاست سے وابستگی کے مقابلے میں بے تعلقی کو زیادہ ترجیح دی ہے۔

ان کے تین دیوان ہیں اور تینوں چھپ چکے ہیں۔ ان میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ اس کے بعد کچھ قطعات اور تاریخیں ہیں۔

انتخاب

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا
اے بتو ہوتی اگر مہر و محبت تم میں
کوئی کافر بھی نہ واللہ مسلماں ہوتا

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں
سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

تمام عمر یوں ہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا

چلا عدم سے میں جبر آ تو بول اٹھی تصویر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

ایسا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا   گم ہوگئے جس پہ کھدے نام ہمارا

مغتنم وصل میں ہے دورِ شراب آخرِ شب
ساقیا مرغِ سحر کے ہوں کباب آخرِ شب

وہ نہیں آتے تو مانندِ چراغِ مُردہ
شبِ تاریک میں بیٹھا ہوں اکیلا خاموش

مثلِ پروانہ، نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تم پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں
ہو گیا زرد، پڑی جس پہ حسینوں کی نظر
یہ عجب گُل ہیں کہ تاثیرِ خزاں رکھتے ہیں

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

دو روزہ ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں
شمارِ دانۂ تسبیح میں امام نہیں

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

ہووے محبوب اجل آ کے ہم آغوش کہیں
یار و اغیار کے شکوے ہوں فراموش کہیں

طبع خام سے پھیلے جو کسی کے آگے!! یارب ایسا تو مجھے ہو نہ میسّر دامن

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

سرو کو اس قدِ موزوں سے بھلا کیا نسبت
کہ معانی سے ہے یہ مصرعِ مہمل خالی

کشتی اس کی نہ ڈوبے صورتِ موج جو کہ طوفاں کو ناخدا جانے

آتی جاتی ہے جا بجا بدلی ساقیا! جلد آ، ہوا بدلی

بھول کر اِدھر چاند کے ٹکڑے اِدھر آ جا کبھی
میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

غم دیا، رنج دیا، درد دیا، داغ دیا! ہو سکیں مجھ سے عوض کیا ترے احسانوں کے

دشتِ غربت میں نگہ اپنی جدھر جاتی ہے

وہیں کوچہ وہی دیوار نظر آتی ہے

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی　　عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

شاہ نصیر

متوفّی — ۱۸۳۸ء

نصیر الدین نام، تخلّص نصیر۔ شاگرد میر محمدی مائل۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ غیر معمولی طور پر کالے ہونے کی وجہ سے کلّو میاں، بھی کہلاتے تھے۔ ان کے والد شاہ غریب ایک گوشہ نشین فقیر تھے، اپنی محدود آمدنی کے باوجود بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی بہت کوشش کی مگر شاعری کے علاوہ اور انھوں نے کچھ کر کے نہ دیا۔ حاضر جواب اور بذلہ سنج بھی تھے۔ شاہ عالم کے دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ قدر دانیوں اور انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے رہے، اپنے گھر پر بھی بزمِ سخن آراستہ کرتے اور اس زمانے کے مشہور شعرا اس میں جمع ہوتے تھے۔ ذوق کی شہرت انھیں مشاعروں سے ہوئی۔

جب دہلی پر تباہی آئی تو انھوں نے بھی دوسرے باکمال شاعروں کی طرح یہاں سے نکل کر کہیں اور عافیت تلاش کرنا چاہی بہت سی

جگہوں کے سفر کیے۔ پہلی بار جب لکھنؤ گئے تو مصحفی، جرأت اور انشا کا زمانہ تھا، ان لوگوں سے خوب خوب معرکے رہے۔ دوسری بار جب وہاں پہنچے تو ناسخ و آتش کا دور دورہ تھا، ناسخ سے بھی انھوں نے مقابلہ کیا۔ مہاراجا چندو لال شاداں کی شہرت اور قدر افزائیاں ان کو حیدر آباد لے گئیں، خاطر خواہ آؤ بھگت ہوئی، بہت سے لوگ شاگرد ہوئے، شاعری کا بازار جو وہاں کچھ سرد ہونے لگا تھا ان کی وجہ سے اس میں پھر گرمی آگئی۔ وطن کی آمد و رفت بھی جاری رہی، چوتھی بار جب حیدر آباد گئے تو پھر واپس نہ آسکے۔ "چراغ گل" ہو گیا اور وہیں کی مٹی ۱۲۵۴ھ بھی عزیز ہوئی۔

شاہ نصیر کی مدتِ شاعری ساٹھ سال تک بتائی جاتی ہے ظاہر ہے اتنے دنوں میں انھوں نے کیا کچھ نہ کہہ ڈالا ہوگا۔ پورا کلام محفوظ نہ رہنے کے باوجود مہاراج سنگھ (ایک شاگرد) نے تقریباً ایک لاکھ شعر دیوان کی صورت میں جمع کیے تھے اور میر عبدالرحمان نے بھی ان کا ایک دیوان ترتیب دیا تھا۔

شاہ نصیر بڑے حاضر دماغ اور پُرگو شاعر تھے۔ نہایت سخت اور سنگلاخ زمینیں تلاش کر کے ان میں دو دو تین تین غزلیں کہہ کے رکھ دیتے تھے۔ رعایتوں اور پُرشکوہ الفاظ کے عاشق تھے، عجیب و غریب ترکیبیں، دلچسپ استعارے اور انوکھی تشبیہیں ان کی شاعرانہ خصوصیتوں میں داخل تھیں۔ مختصر یہ کہ اپنے زمانے کے مانے ہوئے اُستاد تھے۔ مومن (جنھوں نے ابتدا میں کلام دکھایا) اور ذوق (جو بعد میں حریف بن گئے تھے) کے علاوہ دہلی اور حیدر آباد میں انھوں نے اپنے سیکڑوں

شاگرد چھوڑے۔

انتخاب

شیشۂ بادۂ گُل رنگ ٹپک دے ساقی — جامۂ سبز میں دیکھے جو تنِ سُرخ ترا
رشکِ نیلم ہی نہیں، رنگِ مِسی کی یہ نمود — لب بھی ہے غیرتِ لعلِ یمنِ سُرخ ترا

وائے اے شیشۂ دل سینے میں مانندِ حباب
ٹھیس سے اس نفسِ سرد کی تو ٹوٹ گیا

کعبے سے غرض اس کو نہ بت خانے سے مطلب
عاشق جو ترا ہے نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا

آہ کچھ ہم کو نہ تھی، فرصتِ یک دم کی خبر — اے حبابِ لبِ جُو تو نے یہ عقدہ کھولا

نصیرؔ اُس شوخ کی یہ کج ادائی کوئی جاتی ہے
مَثَل مشہور ہے، رسی جلی، لیکن نہ بل نکلا

افسوس کہ نرگس کی طرح باغِ جہاں میں
کچھ ہم نے بجز حسرتِ دیدار نہ پایا

صیّاد قفس کو نہ اُٹھا صحنِ چمن سے — باقی ہے ابھی مرغِ گرفتار کی حسرت

خیالِ زلف میں ہردم نصیرؔ پیٹا کر گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

اودی وسمے کی نہیں تیری رضائی سر پہ
مہ جبیں، رات ہی تاروں بھری چھائی سر پہ

جوں ذرّہ نہیں ایک جگہ خاک بسر ہم
اے مہر جہاں تاب! جدھر تو ہے اُدھر ہم

ہر قصے کو اُلٹ مُنہ سے جو کرتا ہی تو باتیں اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم

نہا کے افشاں چنو جبیں پر، نچوڑو زلفوں کو بعد اُس کے
دکھاؤ عاشق کو اس ہنر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
غضب ہے چیں بر جبیں وہ کیا ہے ابدن سے ٹپکے بھی ہے پسینا
عیاں ہے یاروں نئے ہنر سے، فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

ہے یہ تمنّا میرے جی میں، یوں تجھے دیکھوں بادہ کشی میں
ہاتھ میں ساغر، بر میں مینا، سر پہ طرّہ، ہار گلے میں

مردِ جوانی میں تو ہے سیدھا، پیری میں جھک جاتا ہے
قوت و ضعف کی ہے یہ علامت، تگاہ خدنگ و گاہ کماں

بادہ کشی کے سکھلانے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں
کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہی مہینے ساون بھادوں

سیر مژگاں سے وقتِ نالہ آنسو کو ترستے ہیں
یہ سچ ہے جو گرجتے ہیں وہ بادل کم برستے ہیں

اے بادِ صبا ہم تو ہوا خواہ ہیں تیرے
مشتاق ہیں گل کے نہ طلب گارِ گلستاں

وجہ معلوم تو ہو چیں بہ جبیں ہونے کی
سچ کہو جی میں ہر کیا، کس سے لڑا چاہتے ہو

دیکھ لیتی جو اٹھا کر ترے کیا ٹوٹتے ہاتھ
لیلیٰ اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

وحشت سے مجھے ہاتھ اُٹھانے نہیں دیتی
پڑتے ہیں مرے پاؤں سلاسل کئی دن سے

نسیم

۱۸۱۱ —— ۱۸۴۳ء

منشی دیا شنکر نسیم ابن گنگا پرشاد کول، لکھنؤ کے ایک مشہور و معزز کشمیری پنڈتوں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اسی شہر میں پیدا ہوئے، صرف ۳۲ سال زندہ رہے، اور اتنی ہی تھوڑی سی عمر میں عزت اور شہرت حاصل کر کے راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔ دستور کے مطابق ابتدا میں اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی، بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ بیس سال کی عمر میں آتش کے شاگرد ہوئے، مشق اور مطالعے سے فارسی میں خاصی دستگاہ پیدا کر لی تھی، نیز شعر و سخن میں بھی اپنے ہم عصروں میں قابلِ لحاظ سمجھے جانے لگے تھے۔

اردو مثنویوں میں قبولِ عام حاصل کرنے والی دو مثنویاں ہیں "سحر البیان" اور "گلزارِ نسیم"۔ دراصل میر حسن ہی سے متاثر ہو کر یا اس کے جواب میں نسیم نے گل بکاؤلی کے مشہور قصے کو نظم کا جامہ پہنایا۔ پہلے یہ مثنوی نہایت طویل اور ضخیم تھی، استاد نے اختصار کا مشورہ دیا، ہنرمند شاگرد نے اس کو واقعی اتنا مختصر اور جامع کر دیا کہ اب تک سینکڑوں بار یہ مثنوی چھپی اور ہزاروں آدمیوں نے اسے پڑھا ہے۔ آج بھی اس کی خوبیاں باقی اور لطف برقرار ہے اس کے

بہت سے شعر ضرب المثل بن گئے ہیں۔

نسیم نے غزلیں بھی کہی ہیں اور ۱۸۷۳ء میں "دیوان نسیم" چھپا مگر ان کی اصل شہرت اور مقبولیت کا سبب مثنوی گلزار نسیم ہے۔

جذبات نگاری، بعض مناظر و واقعات کی عکاسی اور ترجمانی اس کا ایجاز و اختصار، الفاظ کی برجستگی، محاورات، نادر تشبیہیں اور استعارے، رمز و کنائے، صنائع و بدائع اور بہت سی شاعرانہ خصوصیتیں اور التزامات اس کثرت اور حسن اہتمام سے اس مثنوی میں جمع کر دیے گئے ہیں کہ اپنی صنف کی ایک لاجواب چیز بن گئی ہے۔ باوجود اس کے کہ اس میں تکلف اور تصنع سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن دوسری خوبیوں کے مقابلے میں ان کمیوں کا زیادہ احساس نہیں ہوتا۔

نسیم بڑے حاضر جواب، خوش مذاق، وضع دار اور بہت سے مشرقی اوصاف و اقدار کے آئینہ دار لوگوں میں سے تھے۔

انتخاب

تغزّل

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو بلکہ اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بارِ شکم تھے مر کے وبالِ دوش ہوئے

جب دن کو نکلو تو خورشید گرد سر گھومے
چلو جو شب کو تو قدموں پہ آفتاب گرے

منّتِ دِلا! کسی کی نہ اصلا اٹھایئے
مرجایئے، نہ نازِ مسیحا اُٹھایئے

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

لائے اُس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

کیوں خفا رشکِ حور ہوتا ہے
آدمی سے قصور ہوتا ہے
خاکساری وہ ہے کہ ذرّوں پہ
روزِ بارانِ نور ہوتا ہے

مثنوی

جاگی مُرغِ سحر کے غُل سے
اُٹھی نکہت بھی فرشِ گُل سے
دیکھا تو وہ گُل ہوا ہُوا ہے
کچھ اور ہی گُل کِھلا ہوا ہے
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گُل
سوسن تو، بتا کدھر گیا گُل
سُنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد انھیں سولی پہ چڑھانا
تھرّائیں خواصیں صورتِ بید
اک ایک سے پوچھنے لگی بھید
بتا بھی تیے کو جب نہ پایا
کہنے لگیں کیا ہوا خدایا
جس کف میں وہ گُل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گُل چراغ ہو جائے
بولی وہ بکاولی کہ افسوس
غفلت سے پھول پہ پڑی اوس
گُل چیں کا جو ہاتھ ہائے ٹوٹا
غنچے کے بھی مُنہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار اڑا نہ تیرا چنگل — شکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا! ہوا نہ بتلا — خوش بُو ہی سنگھاتا نہ بتلا
ہاتھوں کو مَلا کہا کہ ہیہات — خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات
یہ کہہ کے جنون میں غضبناک — خوں روئی، لباس کو کیا چاک
تھی بس کہ غبار سے بھری وہ — آندھی سی اُٹھی ہَوا ہوئی وہ
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے — پتّا نہیں حکم بن ہلا ہے

سودائے الم ہے اب جو تحریر — حرفوں سے قلم ہے پا بہ زنجیر
کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
صورت میں خیال رہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

۱۷۷۸ — ۱۸۴۶ء

خواجہ حیدر علی نام۔ آتش تخلص، بزرگوں کا وطن دہلی، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش دہلی سے جاکر فیض آباد میں مقیم ہو گئے، حیدر علی (آتش) یہیں پیدا ہوئے تھے۔
ابھی جوان بھی نہ ہوئے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ متعلقین میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی تعلیم و تربیت کی فکر کرتا۔ فوج

کے لڑکوں کی صحبت میں پڑکر "بانکے" اور "شورہ پشت" بن گئے۔

اس زمانے کے ایک وضع دار امیر، نواب محمد تقی کے یہاں نوکری مل گئی۔ انھیں کے ساتھ لکھنؤ پہنچے اور پھر مرتے دم تک یہیں رہے۔

آتش جب لکھنؤ پہنچے تو یہاں دربار سے لے کر کوچہ و بازار تک ہر جگہ شعر و سخن کا زور دورہ تھا۔ کہیں جرأت کی شوخی و معاملہ بندی کے چرچے تو کسی طرف انشا و مصحفی کے معرکے، اسی فضا میں وہ بھی شعرگوئی کی طرف مائل و متوجہ ہوئے۔ مصحفی کی شاگردی اختیار کی، تھوڑے ہی دنوں میں اپنی مشق و محنت کی بدولت ایک صاحبِ طرز اور بلند پایہ سخن ور بن گئے۔

بانکپن اور شورہ پشتی کے علاوہ رندانہ مزاجی بھی ان کی سیرت کا ایک نمایاں جزو رہا ہے۔ درباداری، مدّاحی اور قصیدہ خوانی ان سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ بادشاہ کے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا، شاگرد اور ارادت مند بھی خدمت کرتے رہتے تھے۔ محدود ضروریات کے لیے تھوڑی سی رقم گھر میں دے کر باقی روپیہ پیسہ غریبوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ فقر تو اکثر رہا مگر کبھی کبھی فاقوں کی نوبت آجاتی تھی۔ شعر و شاعری کے معاملے میں ناسخ سے اکثر نوک جھونک رہی مگر باہمی یگانگت میں فرق نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ ناسخ کی موت سے اتنے مغموم اور متاثر ہوئے کہ شعر کہنا چھوڑ دیا۔

غزل کے علاوہ کسی دوسری صنفِ سخن کی طرف توجہ نہیں کی۔ چنانچہ غزلوں ہی کا ایک دیوان ان کا سرمایۂ شاعری ہے جو ان کی زندگی میں رائج اور مقبول ہو گیا تھا۔ وفات کے بعد کچھ اور کلام ان کے

شاگردوں نے جمع کیا اور اسے بطور تتمہ دیوان میں شامل کر دیا۔

اردو شاعری میں آتش کا مرتبہ بہت بلند ہے، غالب کو ان کے یہاں "بیشتر نشتر" نظر آئے۔ آزاد (محمد حسین) ان کے کلام کو "محاورۂ اردو کا دستور العمل" سمجھتے تھے۔ زبان کی تراش خراش صفائی اور پاکیزگی کے معاملے میں ان کی کوششوں کو بہتوں نے مانا اور سراہا ہے۔ سوز و گداز میں یہ اپنے حریف اور ہم عصر شعرا میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ خلیل، رند، نسیم (صاحبِ گلزارِ نسیم) نواب مرزا شوق (زہرِ عشق کے خالق) جیسے نامور شاگرد جس کے رہے ہوں، اس کی استادی میں کسے شبہ ہو سکے گا۔

انتخاب

زینہ صبا کا ڈھونڈھتی ہے اپنی مُشتِ خاک — بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ کر چلے گئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجیے دہن بگڑا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

کام رہنے کا نہیں بند اپنا   بندہ پرور ہے خداوند اپنا

اُس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ، بچاؤں کدھر کی چوٹ

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے، ہو جس کے مقدّر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے، نہ شیشے میں، نہ ساغر میں

نہ تو دشمن کوئی میرا، نہ کوئی میرا دوست   بارِ خاطر نہ کسی کا، نہ غبارِ دشمن

باغ میں آئے ہو ساتھ اُن کے بھی پھر لو دو گام
کبک و طاؤس کا جھگڑا ہی چکا تے نہ چلو

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

نقش پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آ رہی دو قدم میں راہ طے ہے شوقِ منزل چاہیے

ان سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے دو گام
گر ہی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی قبائے گُل میں گل بوٹا کہاں ہے

صبا

متوفی ـــــ ۱۸۵۵ء

نام وزیر علی، صبا تخلص، لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو ونما ہوئی، اپنے ماموں کی نگرانی اور سرپرستی میں تعلیم حاصل کی، فارسی میں معقول اور عربی کی بقدر ضرورت استعداد رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ کی سرکار سے وظیفہ اور محسن الدولہ بہادر کے یہاں سے ہر مہینے اتنا مل جاتا تھا کہ آرام سے گزر ہو جاتی تھی، صبح سے شام تک احباب کا مجمع اور شعر و شاعری کا مشغلہ رہتا تھا۔ شریف، خلیق، ملنسار اور یار باش قسم کے آدمی تھے، شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی اور خدا داد صلاحیت۔ آتش کی شاگردی نے اس ہنر میں اور اضافہ کیا۔ مستند استاد کے قابل فخر شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی اساتذہ میں شمار ہونے لگے تھے، جناب آتش کے جملہ شاگردوں میں سے جتنے صاحب دیوان شاگرد صبا کے ہیں اتنے اور کسی کے نہیں۔ ہم عصر مشاہیر میں منیر شکوہ آبادی اور مرزا حاتم علی مہر سے بھی بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔

غنچہ آرزو کے نام سے ایک ضخیم دیوان شائع ہو چکا ہے۔ صبا کا کلام زبان دانی اور فصاحت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، انداز بیان سلیس، با محاورہ اور رواں ہے۔ زبان کو صاف اور پاکیزہ بنانے میں ان کی

خدمات اور کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
۱۸۵۵ء میں گھوڑے سے گر کر وفات پائی۔

انتخاب

دل میں اک درد اُٹھا، آنکھیں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

جائے عبرت ہے جہانِ بے ثبات　　دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا

بُلبُل کہاں، بہار کہاں، باغباں کہاں　　وہ دن گزر گئے، وہ زمانہ گزر گیا

حوروں کی طرف لاکھ ہو زاہد کی توجہ　　کُھل جائیں گی آنکھیں جو کبھی تو نظر آیا

مِحوِ ابرو کے لیے خنجرِ فولاد آیا　　ذبح کرنا بھی نہ تجھ کو مرے جلّاد آیا

فصلِ خزاں چمن میں جو آئی تو اے صبا　　روئے لپٹ لپٹ کے بہت باغباں سے ہم

فکر کو مَیں کی رہتی نہیں مے خواروں میں　　غم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یاروں میں

ہمیں کو رنج دے کر اُلٹے شکوہ ہے ہم سے کرتے ہو
جواب اپنا نہیں رکھتے ہو تم باتیں بنانے میں

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی
لیجیے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں
اے صبا جس کے لیے ہوں میں پریشاں خاطر
جانتا ہے وہ مجھے گیسوؤں والا دل میں

آپ ہی اپنے ذرا، جور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

چشم پُر آب سے ہے نشو و نما ساون کی
نفسِ سرد نے باندھی ہے ہوا ساون کی
گرمیوں میں جو پریشاں ہوئے ہم بادہ پرست
مانگی سر کھول کے ساقی نے دعا ساون کی

حرم کو اس لیے اُٹھ کر نہ بت کدے سے گئے
خدا کہے گا کہ جورِ بتاں اُٹھا نہ سکے

خدا کا قہر، بتوں کا عتاب رہتا ہے
اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں ہیں ایک مشتِ خاک کے

حالِ دل کہیے، تو کس طرز سے وہ کہتے ہیں
تم سلامت رہو الفت کے جتانے والے
کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

مومن

۱۸۰۱ ——————— ۱۸۵۲ء

حکیم محمد مومن خاں مومن۔ گھر والوں کا رکھا ہوا نام حبیب اللہ، مگر دنیا اُن کو اُسی نام اور تخلص سے جانتی ہے یاد کرتی ہے جو ان کے بزرگوں کے بزرگ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے پیدائش کے وقت تجویز کر دیا تھا۔

مومن کے دادا حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں شاہ عالم کے عہد میں کشمیر سے دہلی آئے تھے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے تھے۔ جن خدمات کے صلے میں جاگیر، مراعات، وظیفے اور پنشن کا جو سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوا تھا وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور تک مومن خاں کو بھی ملتا رہا۔

ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی عربی درسیات کی تکمیل شاہ عبدالقادر سے کی۔ طب اپنے والد غلام نبی خاں اور چچا سے پڑھی پھر انھیں بزرگوں کی زیرِ نگرانی اپنے آبائی مطب میں نسخہ نویسی کی۔ بے حد ذہین اور غیر معمولی حافظے کے مالک تھے۔ حساس طبیعت اور موزوں سرشت تھے ہی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے چند دنوں شاہ نصیر سے اصلاح لی اس کے بعد اس سلسلے کو ترک کر کے اپنی

خداداد صلاحیتوں سے ایک صاحبِ طرز شاعر کی حیثیت سے نمایاں
ہونے لگے۔ شیفتہ، تسکین، وحشت اور نسیم جیسے مشاق اور صاحبِ
دیوان شاعروں نے اُن کو اپنا اُستاد بنایا۔

طب اور شاعری کے علاوہ علمِ نجوم سے زبردست واقفیت
اور رمل کی مہارت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ وقت کے بہترین
شطرنج کھیلنے والوں میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔

مومن خاں نہایت خوش رو، خوش آواز، جامہ زیب، زندہ دل
یار باش اور رنگین مزاج آدمی تھے۔ تیس بتیس سال کی عمر میں دنیا
کی لذتوں اور جوانی کے مشغلوں سے کنارہ کش ہو کر سید احمد شہیدؒ
کے مرید ہو گئے اور اس کے بعد کی زندگی زہد و پاکبازی کے عالم
میں گزاری۔

مومن اپنے عہد کے بڑے جامع اور باکمال شاعر تھے کوئی
صنف سخن ایسی نہیں جس میں دادِ سخن وری نہ دی ہو۔ انفرادیت
ہر جگہ نمایاں ہے، مثنویوں میں ان کی آپ بیتی جھلکتی ہے۔ قصائد میں
خودداری، مذہبیت اور خود پسندی یا ایک جگہ شکر گزاری نظر
آتی ہے۔ قطعات اور تاریخوں میں لطف و اعتماد کے ساتھ عام راہ
سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی ہے، غزلیں ان کی نازک خیالی، معنی
آفرینی، اثر، کیف اور ترنم سے لبریز ہیں۔ اُمرا کی مداحی یا ہجو گوئی
سے اپنا قلم یا زبان آلودہ نہیں کی۔ دولت و شہرت کی خاطر اپنے وطن
سے باہر جا کر رہنا ہرگز گوارا نہیں کیا۔ منصب و توقیر حاصل کرنے کے
موقعے کئی بار آئے مگر انھوں نے اپنا رخ اس طرف کیا ہی نہیں۔

ان اوصاف وکمالات کے باوجود بعض اعتقادی مسائل اور علمی معاملات میں ان کے یہاں غلو، اور شدت بھی پائی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مومن خاں اپنے بعض ہم عصروں کے مقابلے میں ذرا دیر میں ممتاز و مقبول ہوئے۔ بہر کیف آج بیسویں صدی کا سخت سے سخت نقاد اور نکتہ چین مومن کی غزل گوئی کا مداح اور ان کے اکثر محاسن کا معترف ہے۔

اُردو کلیات کے علاوہ مومن کا فارسی زبان میں بھی ایک دیوان موجود ہے جس کی "دل فریبیاں" بعض لوگوں کے خیال میں اُردو کے کلام سے کچھ کم نہیں ہیں۔

انتخاب

دردِ ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں جاری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

ان نصیبوں پر کیا اخترشناس آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پہ گراں نہیں اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بےکسی سے ہم

تا نہ خلل پڑے کہیں آپ کے خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں
تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں
بے ہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گیا اضطراب میں

کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ
بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

صبحِ عشرت ہو وہ شامِ وصال
ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

سونے سے اُٹھ کر آئے ہیں یارب نہ جائیں وہ
شرمندہ آہِ شب سے دعائے سحر نہ ہو

مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی　　آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے
ہم نکالیں گے سُن اے موجِ ہوا بل تیرا
اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

کیوں کر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے　　کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے
بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ　　اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے　　زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی　　تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
کہا اُس بُت سے مرتا ہوں تو مومنؔ　　کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

خدا کی بے نیازی ہائے مومنؔ　　ہم ایماں لائے تھے نازِ بُتاں سے

وزیرؔ

۱۸۱۳ــــ۱۸۵۳ء

نام محمد وزیر، تخلص وزیرؔ۔ ابن خواجہ محمد فقیر۔ وطن لکھنؤ۔ ان کا نسبی سلسلہ والد کی طرف سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے اور والدہ، مرزاؤں کے ایک مشہور اور معتقد خاندان سے تھیں، عالی نسبی کے علاوہ ذاتی تقدّس کی وجہ سے بھی یہ بڑی عزّت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ گوشہ نشینی اور توکل بھی باپ دادا سے ورثے اور ترکے میں ملا تھا۔ فارسی زیادہ جانتے تھے اور عربی کم بلکہ بقدر ضرورت، اور یہ دونوں زبانیں انھوں نے علمائے لکھنؤ سے سیکھی تھیں۔ فنِ عروض اور علم قافیہ میں ماہر تھے، شعر و سخن کی طرف بچپن ہی سے مائل تھے، شیخ امام بخش ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ اور انھیں کی زندگی میں مسلم الثبوت استاد بن گئے۔ ناسخؔ کو وزیرؔ پر بڑا فخر اور اعتماد تھا۔ مختلف حیثیتوں سے ان کی حوصلہ افزائیاں کرتے رہتے تھے، بسا اوقات اصلاحِ سخن کا کام بھی انھیں کے سپرد کر دیتے تھے۔

وزیرؔ کا توکّل اور قناعت پسندی بھی مشہور ہے۔ عمر بھر کہیں نوکری نہیں کی۔ حد یہ ہے کہ ایک دو بار دربارِ بادشاہِ وقت کی طرف سے بھی بلوائے گئے۔ مگر انھوں نے دربار تک جانا گوارا نہ کیا اور معذرت

کیا کبھی۔ اچھا خاصا خرچ تھا اور آمدنی کا بظاہر کوئی وسیلہ نہ تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کو دستِ غیب ہوتا ہے۔ آخری عمر میں شعروشاعری سے الگ ہو کر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ فتوح اور تسخیر اعمال میں مصروف رہنے لگے تھے۔ بیشتر اوقات میں بیٹھے نقوش بھرا کرتے تھے۔ کلام کی جمع و ترتیب کی خود کبھی کوئی خواہش یا کوشش نہیں کی۔ وفات کے بعد ان کے بعض دوستوں اور شاگردوں نے ان کا کچھ کلام یک جا کیا اور "دفترِ فصاحت" کے نام سے ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۴ء میں شائع کیا۔ وزیر نے اپنے استاد کے رنگ کو اپنانے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے۔ وہی مشکل زمینوں میں طبع آزمائیاں، بلند مضامین، متین لب و لہجہ اور منجھی ہوئی زبان غرض تاثیر کے علاوہ باقی لوازمات اور محاسنِ شاعری وزیر کے دیوان میں موجود ہیں۔

انتخاب

بہت کچھ کھو کے پائی اس نے راہِ خود فراموشی
دلِ گم گشتہ آپ ہی خضر ہے اپنے بیاباں کا
فلک پر ہے دماغ اے منعمو! اپنا گدائی میں
بہت ہے بوریا، خواہاں نہیں تختِ سلیماں کا

سر جھکائے رہا سدا گردوں — کیا گیا تھا، جو شرمسار رہا
اُٹھ گیا یار میرے پہلو سے — درد پہلو میں یادگار رہا

دیکھا حسرتِ دیدار اسے کہتے ہیں
پھر گیا منہ تری جانب دمِ مردن اپنا

شیفتہ زلفِ دوتا ہو گیا　　خود ہیں گرفتارِ بلا ہو گیا
بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا ہو گیا　　اُٹھ کے چلے حشر بپا ہو گیا

تعریف پہ شیریں کی عبث ہونٹے ہو کڑوے　　تم نیک سہی سارا زمانہ نہیں اچھا

بات کا اپنی نہ جب پایا جواب　　ہم یہ سمجھے وہ دہن ہے لاجواب

باقی رہا تھا جیب، سو ٹکڑے اُڑا دیا
دستِ جنوں نے خوب کی امداد یا نصیب

ٹھہرا آسا ہوں سیہ بختی سے　　پھر ہیں نظروں سے گرا کیا باعث

ترے کوچے کی شاید راہ بھولی　　صبا پھرتی ہے مضطر کو بہ کو آج

گئی زمیں سے فلک تک، فلک سے عرش تلک
پھری تلاشِ اثر میں کہاں کہاں فریاد
کسی کی خاطرِ نازک کا جب خیال آیا
زباں تک آکے ہوئی زیرِ لب نہاں فریاد

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر
اسی خاطر تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

ہوں وہ مزدور کہ مر کر نہ ہوا چھٹکارا　　لے چلا بارِ غمِ فرقتِ یاراں سر پر
آئیں گے وقتِ خزاں، چھوڑ دے آئی ہے بہار　　لے کے صیاد قسم، رکھ دے گلستاں سر پر

نہ کر نظر مرے جرم و گناہِ بے حد پر　　الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں عدو نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج　　یہ ان کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو　　کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ہے چشمِ نیم باز، عجب خوابِ ناز ہے　　فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

ہوئی گر صلح بھی، تو بھی رہی جنگ　　ملا جب دل تو آنکھ اُس سے لڑا کی

پڑا ہے تفرقہ بے تابیوں سے　　وزیرؔ اب میں کہیں ہوں، دل کہیں ہے

ذوقؔ

۱۷۸۹ء — ۱۸۵۴ء

نام محمد ابراہیم، تخلص ذوقؔ، دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں وفات پاکر مدفون ہوئے، ان کے والد شیخ محمد رمضان ایک معمولی سپاہی تھے، ان کی پرورش، تعلیم اور تربیت میں نہ کہیں امارت نظر آتی ہے اور نہ اہتمام، ہوش سنبھالا تو دستور کے مطابق محلے کے اور لڑکوں کی طرح حافظ غلام رسول کے مکتب میں بٹھا دیے گئے، حافظ صاحب کو شعر و شاعری سے بھی تھوڑا سا لگاؤ تھا۔ شوقؔ تخلص فرماتے تھے، شیخ صاحب نے مشاعروں میں جانا شروع کر دیا، پسندیدہ شعروں کو سنتے ہی یاد کر لیتے، تھوڑے دنوں میں خود بھی کہنے لگے، اپنے ایک دوست کے مشورے سے شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہو گئے۔ شاگرد کی غیر معمولی صلاحیت دیکھ کر اُستاد نے ہمت افزائی کے بجائے بے اعتنائی برتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر اُستادی شاگردی کا وہ سلسلہ ہی منقطع ہو گیا۔ مشق، محنت اور خدا داد صلاحیتوں سے کام لے کر شعر کہتے رہے اور چند ہی دنوں میں مقبولِ خاص و عام بن گئے۔ خوش قسمتی سے بہادر شاہ ظفرؔ کی اُستادی کا شرف حاصل ہو گیا۔ اب ان کی اُستادی ہر لحاظ سے مشہور اور مسلّم ہو گئی۔

شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے ذوقؔ کی فطری سادگی معمولی رہن سہن طبعی انکسار اور شاعری کے میدان میں خلوص اور کاوش کے ساتھ جو کارہائے نمایاں انجام دے رہے تھے ان میں کوئی فرق نہیں واقع ہوا۔ متقی، پرہیزگار، رحم دل اور عبادت گزار لوگوں میں سے تھے۔

زبان کی صفائی اور اس پر جلا، محاورات کی برجستگی، امثال کا برمحل استعمال، شعروں میں روانی اور جا بجا ترنم، بلند خیالی کے ساتھ ساتھ آسان اور شگفتہ الفاظ ان اوصاف اور کمالات کی بنا پر ذوقؔ کا نام اور کلام ہر دور میں مستند رہے گا۔ قصیدہ گوئی میں بھی سوداؔ کے بعد انہیں کا مرتبہ ہے۔ اسی بنا پر بہت ہی کم سنی میں اکبر شاہ ثانی کے دربار سے "خاقانی ہند" کا خطاب حاصل کیا تھا۔

ذوقؔ نے کم و بیش پچاس سال داد سخن وری دی، اس مدت میں انھوں نے بہت کچھ کہا مگر افسوس کہ اس میں سے بہت کچھ تلف ہو گیا۔ موجودہ کلام مولانا محمد حسین آزادؔ، حافظ غلام رسول ویرانؔ، انورؔ اور ظہیرؔ وغیرہ نے مل کر جمع کیا تھا۔ ذوقؔ کے یوں تو سینکڑوں شاگرد تھے مگر ان میں ظفرؔ، داغؔ، مولانا آزادؔ (محمد حسین)، ظہیرؔ اور انورؔ کا شمار نامور شعرا میں ہے۔

انتخاب

موت اُس کو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور

یوں ترا بیمارِ غم جو ہچکیاں لینے لگا

ہم ہیں اور سایہ تیرے کوچے کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

کہے ہے خنجرِ قاتل سے یوں گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا

میں ہجر میں مرنے کے قریب ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آ پہنچے، نہیں ہو ہی چکا تھا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

سب کو دیکھا اس سے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

آخر گِلِ اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے دل
باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں
نازک کلائیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

سینہ و دل پہ مرے زخمِ جگر ہنستے ہیں
ہنسنے دو چارہ گرو، ہنستے ہی گھر بستے ہیں

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں

جس جگہ بیٹھے ہیں باد یدۂ نم اُٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں

دیکھا دمِ نزع دل آرام کو
عید ہوئی ذوق دلِ شام کو

ساقیا! عید ہے لا بادے سے مینا بھر کے
کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
سر بہ وقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

کیا غرض لاکھ خدائی ہیں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
کبھی افسوس ہے آنا کبھی رونا آنا
دلِ بیمار کے دو ہی ہیں عیادت والے
نہیں جُز شمع مجاور مری بالینِ مزار
نہیں جُز کثرتِ پروانہ زیارت والے

اے ذوقؔ دیکھ دُخترِ رز کو نہ مُنہ لگا
چُھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

رندؔ

۷۷۹ ــــــــ ۱۸۵۷ء

سیّد محمد خاں رندؔ، ان کے والد غیاث محمد خاں، نواب سعادت خاں بُرہان الملک صوبۂ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے۔ نواب آصف الدّولہ کے عہد میں فیض آباد میں پیدا ہوئے، نواب شجاع الدّولہ کی زوجۂ عالیہ امتہ الزہرا عرف بہو بیگم کی زیرِ نگرانی شاہی محل میں بڑے ناز و نعم کے ساتھ پرورش پائی۔ ستائیس اٹھائیس سال تک فیض آباد میں رہے۔ وفا تخلص کرتے تھے، میر مستحسن خلیقؔ (میر انیسؔ کے پدرِ بزرگوار) سے

اصلاح لیتے تھے۔ ایک دیوان بھی مرتب کر لیا تھا۔ بہو بیگم کے انتقال اور ببر علیخان کے فرخ آباد چلے جانے کے بعد یہ بھی لکھنؤ آگئے۔ یہاں کے ہر گلی کوچے میں شعر و سخن کا چرچا تھا اور ہر ایک شعر و شاعری کا متوالا بنا ہوا تھا، آتش کا طوطی بول رہا تھا یہ بھی ان کے شاگردوں کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ وفا کو چھوڑا اور رند بن گئے۔ استاد نے جوہر قابل سمجھ کر ان کی صلاحیتوں کو جلا دی اور شاگرد نے بھی استاد کے نام کو روشن کیا۔

اپنی رنگین مزاجی اور رندمشربی کے باعث لکھنؤ میں اس دور کی ہر رنگینی اور مزے داریوں سے بھی خاطر خواہ لطف اندوز ہوتے رہے استاد کی وفات کے بعد مے نوشی ترک کر دی اور پھر دوسری دلچسپیوں سے بھی کنارہ کش ہو گئے۔ غدر سے کچھ دنوں پہلے حج کے ارادے سے نکلے تھے کہ بمبئی پہنچ کر سفر آخرت اختیار کرنا پڑا۔

دو دیوان رند کی یادگار ہیں۔ پہلا گلدستۂ عشق (جو ۱۸۳۲ء میں مرتب ہوا تھا) دوسرا نامکمل ان کے مرنے کے بعد شائع ہوا۔

آسان، شستہ اور بامحاورہ زبان، مہذب الفاظ، اور دل کش انداز میں واردات اور آپ بیتیاں، کہیں درد و غم کی چاشنی اور کہیں تصوف و اخلاق کے مضامین۔ یہ ہیں کلام رند کی خوبیاں اور صفتیں۔

انتخاب

ہو گیا آب دم تیغ سے بسمل ٹھنڈا
کیوں ہے ہوا اب تو کلیجا ترا قاتل ٹھنڈا

ناز بے جا اُٹھایئے کس کے
اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

بن پڑا کچھ نہ علاجِ تپِ فرقت اس سے
ہاتھ مل کر مری بالیں سے مسیحا اُٹھا

کوہ فرہاد سے، مجنوں سے بیاباں جیتا
وحشتِ دل ترے اقبال سے میداں جیتا

کھُلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیّاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیّاد
ادا اس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
بہت دنوں میں ہوا ہے مزاج داں صیّاد
پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اُڑ جاؤں گا کہاں صیّاد

اگر کسی کا ہے گماں شک ہے ملا گیری کا
رنگ لایا ہے، ڈوپٹا ترا میلا ہو کر

تو ابھی چل اپنے زرا طالبِ دیدار کے پاس
سب عیادت کے لیے جاتے ہیں بیمار کے پاس

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو، ہائے دل پکار میں چلّاؤں ہائے دل

پھر وہی کُنجِ قفس ہے وہی صیّاد کا گھر — چار دن اور ہوا باغ کی کھا لے بُلبل

ہو گئے بے زار عبث گھر کو نہ جاؤ آؤ — تھوڑے سے رنج کو اتنا نہ بڑھاؤ آؤ
دل نہیں دیتا ہیں اس بات پہ آزردہ ہو — روٹھے جاتے ہو اسی بات پہ آؤ آؤ

سیر کی خوب بھرے پھول چُنے شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

دل سینے میں بے تاب ہے جاں آئی ہے لب پر
اب جان کو روکے کوئی یا دل کو سنبھالے
اُو دل ہدفِ تیرِ نگہ پھر کیا تو نے
اگلے ہی مرے زخمِ جگر تھے ابھی آلے
آنکھیں تری بدہوش ہیں تنہا ہے مرا دل
دو مست نہ سنبھلیں گے اکیلے کے سنبھالے

بُت کریں آرزو خدائی کی — شان ہے تیری کبریائی کی

پاسِ دیں کفر میں رہا ملحوظ — بُت کو پوجا خدا کر کے

بس اب آپ تشریف لے جائیے — جو گزرے گی مجھ پر گزر جائے گی
طبیعت کو ہو گا قلق چند روز — ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

ظفر

۱۷۷۵ ——— ۱۸۶۲ء

محمد سراج الدین، نام، ابوظفر، خطاب۔ بہادر شاہ، لقب اور ظفر، تخلص۔ سلطنت مغلیہ کے آخری حرماں نصیب تاج دار۔ ۶۲ برس کی عمر میں تخت نشینی نصیب ہوئی، ۱۸۵۷ء میں نام کی بادشاہی بھی جاتی رہی۔ انگریزوں نے باغی اور باغیوں کا طرف دار قرار دیا۔ جوان بیٹوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا عزیزوں کو پھانسی پاتے ہوئے سنا۔ سلطنت سے معزول، ہر قسم کی آسانی اور راحتوں سے محروم، نظر بندی اور جلا وطنی کے عالم میں رنگون کے بلاخانے کے اندر موت نے زندگی بھر کی کشاکش اور اذیتوں سے چھٹکارا دلایا۔

ظفر کا بچپن اور جوانی دونوں علم کی تحصیل اور فنون کی تکمیل میں گزری۔ وہ ایک بہت اچھے خطاط تھے۔ موسیقی سے بھی ان کو لگاؤ تھا۔ تیر اندازی، تیغ زنی، نشانہ بازی، بانک بنوٹ اور شہ سواری ان سب میں خاص مہارت رکھتے تھے۔

شاعری بھی کم سنی ہی سے ان کے مرغوب ترین مشاغل میں شامل تھی۔ سب سے پہلے عزت اللہ عشق سے مشورۂ سخن کیا، پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی، جب وہ دکن چلے گئے تو کاظم حسین بے قرار

سے مشورہ کرنے لگے پھر اُستاد ذوقؔ کے شاگرد ہوئے، ذوقؔ کے انتقال کے بعد مرزا غالبؔ کی طرف رجوع ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عشقؔ اور بے قرارؔ کو چھوڑ کر باقی تینوں استادوں کا مخصوص رنگ ظفرؔ کے کلام میں جابجا نظر آتا ہے۔ شاہ نصیرؔ کی سی سنگلاخ زمینیں ذوقؔ کی محاورہ بندیاں اور روزمرہ، مرزا غالبؔ کی جدت آفرینیاں اور دقت پسندی، اس کے باوجود ظفرؔ کا اپنا بھی ایک انداز اور ایک رنگ تھا، اتنا واضح اور پختہ کہ وہی چیز ظفرؔ کی شاعری کی جان اور ان کا ایک امتیازی وصف بنی ہوئی ہے۔ ظفرؔ کی سوگواری، ان کے شعروں میں حزن والم کی آمیزش اور درد کی گھلاوٹ، یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ آسانی سے کوئی ان کو فراموش کر سکے۔

ظفرؔ کا پہلا دیوان ۱۸۴۵ء میں مطبع سلطانی قلعہ معلّٰی دہلی میں طبع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسرا، تیسرا اور چوتھا دیوان بھی اسی پریس میں چھپا، پھر چاروں دیوان ایک ہی جلد میں دہلی اور لکھنؤ سے شائع ہوتے رہے، کلیاتِ ظفرؔ عام طور پر اب نہیں ملتا۔ جو نسخے کہیں کہیں دستیاب ہو جاتے ہیں وہ نول کشور پریس کے چھپے ہوئے ہیں۔ غزلوں کے علاوہ ظفرؔ کے یہاں مستزاد، مخمس، تضمین، نعتیہ قصائد، شہر آشوب، مرثیے، سلام، مجرا، سہرا، پنکھا، قطعات، دوہے، ہولی، ٹھمریاں، بھجن اور گیت سب کچھ موجود ہے۔ اُس زمانے کے کسی بڑے سے بڑے استاد نے بھی اتنی بہت سی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی نہیں کی۔ اُردو کے علاوہ فارسی، پنجابی اور بھاشا میں بھی انھوں نے گیت اور غزلیں لکھی ہیں۔

تخت و تاج اور دولت و حکومت نے تو بے شک ظفرؔ کا ساتھ نہیں دیا۔ مگر اقلیم سخن پر جس انداز سے انھوں نے فرماں روائی کی ہے اور جو سکہ وہ رائج کر گئے ہیں اس سے ان کا نام آج تک روشن ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔

انتخاب

ضبطِ فریاد کروں، گریے کو روکوں لیکن
دلِ بے تاب کو تھاموں، یہ نہیں ہو سکتا

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

رفیقِ راہِ محبت کدھر گئے یا رب کہیں نظر ہی نہیں اب وہ قافلہ پڑتا

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

گر ہم ہیں گنہ گار تو کر خاک کا پیوند پردہ نہ اٹھا چرخِ ستم گار کسی کا

پسِ مرگ میرے مزار پہ جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بُجھا دیا

نہ توناب ہے تنِ زار میں نہ قرار ہے غمِ یار میں!
مجھے سوزِ عشق نے آخرش یونہیں مثلِ شمع گھلا دیا!
پسِ مرگ قبر پہ اے ظفرؔ کوئی فاتحہ بھی پڑھے کہاں!
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اُسے ٹھوکروں سے اڑا دیا

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا

وہ کھا گئے سو بار مرے آگے قسم جھوٹ اور پھر یہ دعویٰ کہ نہیں بولتے ہم جھوٹ

پھرے ہے پارۂ دل دیدۂ پُر آب میں یوں
جلا کے چھوڑ دے جیسے کوئی بھنور میں چراغ

دشتِ وحشت کو ارادہ ہے کہ آباد کروں
کھول دے کاش مرے پاؤں کی زنجیر حریف

لختِ دل آنسوؤں کی رو میں چلے آتے ہیں
کیا تماشا ہے کہ یاں بہتی ہے سیلاب میں آگ

کچھ اسیرانِ قفس میں نہ رہا دم شاید
آتی آواز جو ہے خانۂ صیاد سے کم

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا، مجھے سُن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دُکھی کی پکار ہوں

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں — کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن — دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کہہ دو یہ حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں — اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے — دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

وہ دیکھے سوزِ محبت سے دل کے داغ کی لَو
نہ دیکھی جس نے ہو بھڑکے ہوئے چراغ کی لَو

آہ کب سینے سے اے ہم نفساں نکلے ہے
دل میں اک آگ سلگتی ہے دھواں نکلے ہے

پائے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

رُخ پہ کیا زلف ترے غنچہ دہن چھوٹے ہے
ہم سیہ بختوں سے آخر کو وطن چھوٹے ہے

نہ کیوں کہ شوق کی گرمی سے دل کا داغ جلے
وہ کہہ گئے ہیں کہ آئیں گے ہم چراغ جلے

واہ تم صبح کو بھلے آئے دن چڑھے کہہ کے، دن ڈھلے آئے

کچھ آپ سے پروانہ نہیں آگ میں جلتا
لگ جاتی ہے جب شمع کی لو، بن نہیں آتی

شب و روز جو چھالوں میں جو نکلے، کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوقِ قید میں جب انھیں، کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
سبھی جادہ ماتمِ سخت ہے، کہوں کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے، نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
یہ وبال سر یہ ہے تن مرا، نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا، مجھے اپنی زندگی بار ہے

نسیم دہلوی

۱۷۹۹ ——— ۱۸۶۶ء

نام اصغر علی خاں، نسیم تخلص، نواب آقا علی خاں قاجار کے بیٹے،

دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے اور تعلیم و تربیت حاصل کی اور شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئے، مومن کی شاگردی اختیار کی اور ان کے مشہور ترین شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔

مطمئن اور خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اپنے گھر پر بڑے اہتمام سے مشاعرے کرتے تھے مومن اور دوسرے اساتذہ اور دہلی کے سخن فہم جمع ہوتے تھے اور دادِ سخن دیتے تھے۔

باپ کی وفات کے بعد بھائیوں سے اختلاف شروع ہو گئے، اس سے یہ اتنا متاثر اور پراگندہ خاطر ہوئے کہ دہلی کی سکونت ترک کر کے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے، چھوٹے بھائیوں نے اپنی غلطی تسلیم کر کے ہر چند واپس بلانا چاہا، مگر یہ اپنے ارادے پر قائم رہے، لکھنؤ میں پریشانیوں اور تنگ دستی کے ساتھ بقیہ دن گذار دیے مگر دہلی کا رخ نہ کیا۔

مذہبی احکام کے سختی سے پابند، نہایت غیور اور خود دار آدمی تھے۔ منشی نول کشور ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ الف لیلہ کو نظم کرنے کی خدمت ان کے سپرد کر دی، پہلی جلد ختم کر پائے تھے کہ خود ہی ختم ہو گئے۔

شعر و سخن کے معاملے میں لکھنؤ کا مخصوص انداز ان دنوں عروج پر تھا، پھر بھی نسیم کا رنگ پھیکا نہیں پڑا بہتوں کو انھوں نے اپنی طرف متوجہ کیا، متعدد اہلِ سخن ان کے شاگرد ہوئے، عبد اللہ خاں مہر، اشرف علی اشرف اور امیر اللہ تسلیم، ان کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔ غالب کو بھی نسیم کی غزلیں پسند تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ لکھنؤ میں رہ کر

بھی نہ انھوں نے وہاں کی لفظی صنعت گری برتی اور نہ خارجی مضامین سے اپنا واسطہ رکھا۔ لکھنؤ والوں کے متروکات تو بے شک انھوں نے قبول کیے۔ باقی طرزِ ادا، دل فریبیٔ خیال، محاوروں کی صحت اور بندشوں کی صفائی میں انھوں نے وہی اپنی دلی کی روایتوں اور استاد کی روش کو قائم و برقرار رکھا۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان" ان دونوں کا بڑا خوب صورت امتزاج نسیم کے یہاں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے ہر صنف میں بہت کچھ کہا لیکن کبھی ان کی نقل تک اپنے پاس نہیں رکھی، انتقال کے بعد شاگردوں نے بڑی جستجو اور محنت کے بعد تھوڑا سا کلام جمع کیا جسے ان کے ایک شاگرد عبدالواحد خاں مالک مصطفائی پریس نے دیوان کی صورت میں چھپوا دیا۔

غزلوں کے علاوہ بعض لوگ ان کی مثنویوں کے بھی مداح ہیں

انتخاب

ساقی نامہ

طبیعت صورتِ مے جوش میں ہو — تمنا عزمِ نوشانوش میں ہے
نظر آئے کنارِ جامِ گلگوں — لبِ شاعر سے ٹپکے لطفِ مضموں
وفورِ شوق، وقتِ گفتگو ہو — سخن افسانۂ ریزِ آرزو ہو
گلے مِل مِل کے لفظوں سے معانی — دکھائیں گفتگو کی نوجوانی
طبیعت محو ہو عرضِ سخن میں — فسانہ یوں بیاں ہو انجمن میں

تغزّل

جب دیکھیے قرار نہیں ایک حال پر میرا سا اب تو حال ہوا روزگار کا

نام میرا سنتے ہی شرما گئے تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

وحشت میں بھی نہ ترکِ محبت ہوا نسیم منہ آبلوں نے چوم لیا نوکِ خار کا

کہے دیتی ہیں یہ نیچی نگاہیں کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

گلے ہیں بخت کے اُن کا بھی کچھ قصہ نکل آیا
ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

آنکھوں میں ہی لحاظ تبسم فضا ہیں لب شکر خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

ہاتھ میں خنجر، گلے پر تیغِ تیز یہ ارادے ایک مشتِ خاک پر

ہوتی نہیں ہے کم مری ویرانہ دوستی جاتا نہیں ہے سر سے خیالِ وطن ہنوز

ترے چھٹنے سے چھوڑا آنسوؤں نے ساتھ آنکھوں کا
گلے مِل مِل کے آپس میں چلے آتے ہیں دامن تک

آؤ آپس ہیں سمجھ لیں غیر کا ہے کو سُنے
تم کہو دل سے ہمارے کچھ تمھارے دل سے ہم

ہر نفَس نے اک طرزِ بے تابی مرا سیکھا تو کیا سیکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطرِ ناشاد میں

شوقِ شراب و خواہشِ جام و سبو نہیں ہے سب حرام جب کہ پہلو میں تو نہیں

لے جائے اسے بھی سبک دوش، ہوں کہاں دیکھے مری امید بھی اپنی حیا کے ساتھ
گھبرا گئے تو تم ایک ہی عرضِ بیاں میں آج سو حسرتیں ہیں اور مری التجا کے ساتھ

یاد آئے گا ہیں مرگ ہمارا یہ کمال
حال کھل جائے گا جب خاک میں پنہاں ہوں گے

تعلق ان آنکھوں سے پیدا ہوا ہے بہت دن کا یہ خواب دیکھا ہوا ہے

میرا ہی دوست خود سببِ دشمنی ہوا آئیں خرابیاں دلِ خانہ خراب سے

کیا جانیے آتے ہیں کہاں سے مرے شکوے
کم ہوتے ہیں ہر چند مگر کم نہیں ہوتے!
بے فائدہ ہے فکر مری چارہ گروں کو
سب زخمِ جگر قابلِ مرہم نہیں ہوتے

لائے اُس بُت کو التجا کر کے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے
ہیں وہ بے آس ہو کے میرے پاس یاس آتی ہے آسرا کر کے

جب اور کسی پر کوئی بیداد کرو گے بے یار رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

محبّت ہو کسی سے یا عداوت مزا دے جائے گی جو دل سے ہو گی

سفر ہے دشوار خواب کب تک، بہت بڑی منزلِ عدم ہے
نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اُٹھاؤ بستر، کہ رات کم ہے

آزردہ

۱۷۸۹ ——— ۱۸۶۸

نام صدر الدّین، تخلص آزردہ، ابن مولوی لطف اللہ کشمیری،
عربی ادب اور دینیات کی تعلیم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان
کے بھائیوں سے حاصل کی، علوم حکمیہ اور منطق وغیرہ میں مولوی فضل امام
(مولانا فضل حق خیر آبادی کے پدر بزرگوار) کے شاگرد تھے علوم
وفنون کے اکتساب ومہارت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ کوئی ادبی
نکتہ ہو یا مذہبی مسئلہ، فقہ ہو یا شعر وسخن کا معاملہ مفتی صاحب کی رائے

اور ان کا فیصلہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔

ابتدا میں چند غزلیں شاہ نصیر کو دکھائیں، پھر محرم اکبرآبادی سے مشورہ کرنے لگے، آخر میں میر ممنون کے شاگرد ہوئے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے صدر الصدور کے عہدے پر مامور تھے۔ اس زمانے میں کسی ہندوستانی کے لیے یہ ایک غیر معمولی اعزاز اور اعلیٰ ترین منصب تھا۔ ایک طرف اپنے علم و فضل اور فہم و دانش کی بنا پر ہر علمی مجلس اور ادبی محفل کے مربّی و رُکنِ رکین تصوّر کیے جاتے تھے تو دوسری طرف اپنے رسوخ اور دریا دلی کی بدولت ہر ضرورت مند کے معین و مددگار نظر آتے تھے۔ اسبابِ امارت مہیّا ہونے کے باوجود خود نہایت محتاط اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔

شاہ جہاں کے زمانے کا ایک مدرسہ جو امتدادِ زمانہ سے ختم ہوچکا تھا اس کو اپنے صرفِ خاص سے نئی زندگی بخشی۔ درس و تدریس کی سہولتیں بہم پہنچانے میں اپنا قیمتی وقت بھی صرف کرتے تھے۔ کچھ شاگرد ایسے بھی نکلے جو اپنی سخن پروری، علمیت اور ناموری میں ممتاز ہیں۔ مثلاً نواب یوسف علی خاں والیٔ ریاست رام پور، نواب صدیق حسن خاں، آنریبل سر سید احمد خاں۔

ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، صہبائیؔ اور شیفتہؔ سے تمام عمر مفتی صاحب کے بے حد قریب کے مراسم رہے۔ یہ لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور خود مفتی صاحب ان کے سچے قدردان تھے۔ غالبؔ کے ساتھ مفتی صاحب کے احسانات تو مشہور ہیں۔ غدر کے بعد بہت سے بے گناہ اور عزت مآب بزرگوں کی طرح مفتی صاحب

کو بھی ناخوش گوار حالات بلکہ مصائب تک کا سامنا کرنا پڑا۔
شعر و شاعری کا مسلسل شغل رکھنے کے باوجود انھوں نے کبھی نہ اپنا دیوان ترتیب دیا اور نہ آج ان کا کوئی باضابطہ مجموعہ کلام ملتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ عربی فارسی کے آدمی تھے۔ مگر اُردو کا کلام، ان زبانوں کے الفاظ اور ترکیبوں سے کہیں بھی گراں بار نہیں ہونے دیا۔ وہی صفائی اور سادگی وہی روانی اور روزمرّہ جو اس دور کے بلند فکر ریختہ گو شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں بھی دیکھ لیجیے۔

انتخاب

ہوئے ہیں وہ ناقابلوں میں شمار اب
جنھیں مانتے تھے زمانے کے قابل
کروں چاک سینہ تو سو بار لیکن
نہیں داغِ دل یہ دکھانے کے قابل

یارب یہ کس نے چہرے سے اُٹھا نقاب ہے
سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں
ہیں اور ذوقِ بادہ کشی، لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں
یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہدِ شباب میں

تیری آنکھوں کے دور میں کیا کیا
سحر رسوا نہیں خراب نہیں
مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے
اِس کو آرام اُس کو خواب نہیں

نالوں سے میرے کب تہ و بالا زمیں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں

افسردہ دل نہ ہو، درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں

دامن اس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بے کار، گریباں تو مرا دور نہیں

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

گو اسیری میں ہوں پر مثلِ اسیرِ تصویر نہ غمِ قید، نہ پروائے رہائی مجھ کو

اس شوخ سے مربوط بہت سہل سے ہوتے گر ہم بھی ٹک حرکتِ ناہل سے ہوتے

مکھڑا یہ غضب زلفِ سیہ فام یہ کافر
کیا خاک جیئے کوئی شب ایسی، سحر ایسی
نقشے تو بہت صانعِ قدرت نے بنائے
پر بن نہ سکا پھر دہن ایسا، کمر ایسی
بالیں پہ کھڑا روتا ہے، راتوں کو مسیحا
کچھ آن بنی ہے ترے بیمار پر ایسی

مرثیہ دہلی

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل نااہل سے خلطہ جنھیں زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا
آدمی کیا ہے فرشتے کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں دَر دَر
خاک بھی ان کو نہیں ملتی کہ ڈالیں سر پر

زیورِ الماس کا سب، جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی کبھی، سر پہ نہ رکھا جاتا
گاج کا جن سے دوپٹا، نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اڑھاتے، نہ اُڑھایا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لیے، چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو گر پڑتے ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی
مہندی ہاتھوں میں لگا سوتی تو کیا گھبراتی
شام سے صبح تلک نیند نہ جن کو آتی
ایک سلوٹ بھی بچھونے میں گر پڑ جاتی

ان کو تکیے کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اُٹھایا تو سرہانے رکھا

غالبؔ

۱۷۹۷ ——— ۱۸۶۹ء

نام: اسد اللہ بیگ خاں، عرف مرزا نوشہ، پہلا تخلص اسد، دوسرا غالبؔ، نجم الدولہ دبیر الملک بہادر نظام جنگ خطاب، تورانی نسل، آباء واجداد کا تعلق ترکوں کے مشہور قبیلہ ایبک سے تھا۔

غالبؔ کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے تھے لاہور میں ٹھہرے، اس کے بعد دہلی آ گئے، دونوں جگہ ان کو عزت، منصب اور توقیر حاصل رہی۔ غالبؔ کے والد مرزا عبد اللہ بیگ خاں دہلی میں پیدا ہوئے تھے ان کی شادی آگرے میں ہوئی تھی اور غالب کی پیدائش بھی آگرے کی ہے۔ پانچ برس کے سن میں باپ ایک لڑائی میں مارے گئے، چچا نے سر پہ ہاتھ رکھا تھا کہ تین چار برس بعد وہ بھی وفات پا گئے ——— ننہال والے خوش حال تھے وہیں غالبؔ کی اطمینان اور فراغت کے ساتھ پرورش ہوئی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں مولوی محمد معظم سے پڑھیں اس کے بعد ایک نو مسلم عالم عبد الصمد کو دو برس تک اپنے گھر رکھ کر تعلیم حاصل کی۔ مطالعے اور تلاش و تحقیق سے عمر بھر شغف رہا۔

دس گیارہ برس کی عمر سے اُردو میں شعر کہنے لگے تھے۔ چودہ برس

کے اندر تقریباً دو ہزار اشعار کا ایک مجموعہ فراہم ہو گیا تھا یہ محسوس کر کے کہ اس ذخیرے میں اپنا رنگ کم اور بیدل وغیرہ کی تقلید زیادہ ہے، اُس میں سے تھوڑا سا کلام انتخاب کر کے باقی یونہیں چھوڑ دیا تھا (جو ۱۹۲۱ء میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے طبع ہوا)

تیرہ ۱۳ برس کی عمر میں دہلی کے نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے شادی ہوئی، دو تین سال بعد دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ مگر اس طرح کہ عمر بھر کرائے کے مکانوں میں رہے، سات اولادیں ہوئیں مگر سال سوا سال سے زیادہ کسی کو زندگی نصیب نہیں ہوئی۔

غالب کا مزاج شاہانہ، معاشرت رئیسانہ، مشغلے اور حوصلے بڑے دولت مندانہ تھے۔ ابتدائی دور میں تو یہ شوق اور اخراجات پورے ہو جایا کرتے تھے مگر آگے چل کر اس روش کو نبھانا اور ضرورتوں کو پورا کرنا مرزا کے لیے دشواری اور پریشانی کا سبب بن گیا۔ اس کی خاطر ان کو حکومت، رؤسا اور حکّام کی مدّاحی کرنا پڑی، وظیفہ بحال کرانے کے لیے سعی و سفارش میں سرگرداں رہے، سفر کی زحمتیں، زیر باریاں اور بہت سی خلاف طبیعت باتیں برداشت اور گوارا کرنا پڑیں۔ کشمکشِ حیات، نامساعد حالات اور طرح طرح کے افکار کے باوجود ان کے مزاج، معاشرت اور شاعری میں تلخی، تنگی، اور بیزاری یا قنوطیت نہیں حاوی ہونے پائی۔ محبت، مروّت، رواداری، وضع داری، رکھ رکھاؤ اور دوست داری میں کوئی فرق نہیں آسکا۔ طبعی ظرافت سے انھوں نے ہر موقعے پر کام لیا اور زندہ دلی نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ ان کی اہم ضرورتیں اور شوق کون کون سے تھے اور وہ کس طرح پورے کیے

جاتے تھے ان کے بارے میں خود ہی تحریر فرماتے ہیں "........ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام ——— قرض لیا جاتا تھا" اور اسی قرض کے آزار میں وہ مرتے دم تک گرفتار رہے۔ غالبؔ نے اپنی ذات اور زندگی کے بارے میں تمام ضروری اور سچی سچی باتیں اپنے خطوں میں قلم بند کر دی ہیں ——— دعویٰ اور ناز ان کو اپنی فارسی شاعری اور فارسی دانی پر تھا مگر ان کی شہرت اور عظمت کا باعث ان کے وہ خط ہیں جو انھوں نے اُردو میں لکھے ہیں یا وہ اٹھارہ سو شعر ہیں جو ان کے اردو دیوان میں پائے جاتے ہیں، ان کی نام آوری اور مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُن کا اردو دیوان اُن کی زندگی میں چار بار چھپا اور اس کے بعد سے اب تک اس کے سیکڑوں ایڈیشن نکل چکے ہیں ——— ان کے منتخب اشعار کے معانی و مطالب اور پورے دیوان کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں عبدالرحمان چغتائی نے مصوّر ایڈیشن بھی (مرقع چغتائی) شائع کیا بلکہ اور غیر ملکی زبانوں اور مختلف رسمِ خط میں اُردو کے کسی شاعر کا کلام اگر ملتا ہے تو وہ صرف غالبؔ ہیں، اسی طرح ان کے خطوط کے مجموعے "عودِ ہندی" اور "اُردوئے معلّٰی" ان کی زندگی سے لے کر آج تک متعدد بار چھپ چکے ہیں ان کے علاوہ سیکڑوں غیر مطبوعہ خطوط اور رقعات مطبوعہ شکل میں سامنے آ چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

غالبؔ کے یہاں دقتِ نظری اور مشکل پسندی کے ساتھ ساتھ ایسے شعروں کی بھی کمی نہیں ہے جو ہر خاص و عام کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں،

ان کا سا تنوع، خیال آرائیاں، ندرت، مضمون آفرینی، دل کش ترکیبیں، نئے نئے استعارے اور تشبیہیں، مخصوص اندازِ بیان، کیف و مستی کسی اور کے یہاں کم ہی ملے گی۔ ان کے تلامذہ، مداحوں اور قدردانوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آج بھی لکھا جا رہا ہے۔ ان کی تعریف میں مولانا حالیؔ "فخرِ عرفی و طالبؔ" کہہ کر چپ ہو گئے مگر عبدالرحمان بجنوری، نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں — "وید مقدس اور دیوانِ غالبؔ"

اس عظیم شخصیت اور باکمال شاعر نے اپنی زندگی کے آخری دن نہایت ناخوش گوار حالات میں بسر کیے اور ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔ درگاہ نظام الدین کے قریب مدفون ہیں۔ جہاں اس کی یادگار میں ایک چہار دیوازی کے اندر چھوٹا سا خوش نما مقبرہ تعمیر کرا دیا گیا ہے۔

انتخاب

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

بصورتِ تکلف بمعنی تاسف اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

خود پرستی سے رہے باہم دگر ناآشنا بے کسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اے آرزو شہیدِ وفا، خوں بہا نہ مانگ
جز بہرِ دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم

کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ عبداللہ ایابوی نے ان کا ایک نہایت جامع اور مستند تذکرہ ترتیب دیا۔ نیاز کو انھوں نے رلایا، مجنوں کو تڑپایا، عبدالماجد دریابادی جیسے ثقہ انشا پرداز کے قلم سے یہ لکھوایا کہ "....... اردو کے بدنام شاعر..... تو درد بھرا دل رکھتا تھا، تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی تو نے موت کو یاد رکھا، تیری یاد پر انشاء اللہ موت نہ آنے پائے گی"۔

انتخاب

خیر سے موسمِ شباب کٹا چلو اچھا ہوا عذاب کٹا

چمن میں شب کو گھرا ابرِ نوبہار رہا حضور آپ کا کیا کیا نہ انتظار رہا

بے یار گیا ہوں جو کبھی سیرِ چمن کو کانٹا سا چبھا دل میں اگر گل پہ پڑی آنکھ

دیوانہ بھی، سودائی بھی فرماتے ہیں اکثر
ان ناموں سے جانتے ہیں پکارے کبھی دن ہمیں رسے

مثنوی فریبِ عشق

دوست جتنے تھے رہتے تھے ہم راہ "کربلا" میں کبھی، کبھی "درگاہ"
وضع کی گو تھی سب کو پابندی پر نہ بچتی تھی کوئی "نوچندی"
رہتا تھا "بڑھوے کا جلسہ" یاد شام سے جاتے تھے "حسین آباد"

دوپہر رات جب گزرتی تھی ڈولی پر ڈولی پھر اترتی تھی

جی سے اپنے گزر گئی آخر کہہ کے یہ "بات" مر گئی آخر
"نہ لگائے کہیں طبیعت کو کبھی بھولے نہ اس وصیت کو
ان سے مل کر نہ جی گنوائے کبھی مرد کے فقرے پر نہ آئے کبھی
کرتے ہیں یہ دغا جبینوں سے الحذر! اِن تماش بینوں سے

مثنوی بہارِ عشق

حُسنِ یوسف بھی اس کے آگے ماند چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
رُخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال رنگِ گُل سے وہ ہونٹ پان سے لال
بے مسّی کے وہ دانت رشکِ قمر جانِ عاشق نثار ہو جس پر
ناک میں نیم کا فقط "تنکا"!! شوخی، چالاکی مقتضا سِن کا
عکسِ رُخ موتیوں کے دانوں میں بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
رنگِ گُل سے کمر لچکتی ہوئی چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

آئی ماما بھی ایک ہے ہمراہ کتنی چالاک ہے خدا کی پناہ
اپنے سائے سے بھی بھڑکتی ہے بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
ہنسی، ٹھٹھا، ضلع جگت میں طاق چل رہی ہے زباں تڑاق پڑاق

کہتے ہیں صوفیانِ صافی دل کہ ہے عشقِ خدا بہت مشکل!
عشق اللہ کا جو مائل ہو ترکِ دنیا کرے تو حاصل ہو

کوئی اُلفت نہ بے وفا سے کرے　　عشق کرنا ہے جو خدا سے کرے

مثنوی زہرِ عشق

جس محلّے میں تھا ہمارا گھر　　وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
ایک دختر تھی اس کی ماہ جبیں　　شادی اس کی نہیں ہوئی تھی کہیں

دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا　　سیر کرنے کو بام پر آیا
ہوئی میری جو اس کی چار نگاہ　　مُنہ سے بے ساختہ نکل گئی آہ

عیش ہونے لگے مرے اُن کے　　غیر جلنے لگے یہ سُن سُن کے

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں　　بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
جائے عبرت سرائے فانی ہے　　موردِ مرگِ نوجوانی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج　　آج ہیں فاتحے کو وہ محتاج
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے　　یہی دنیا کا کارخانہ ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان　　پڑھتے ہیں "کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ"
موت سے کس کو رستگاری ہے　　آج وہ کل ہماری باری ہے
دل میں لے کر تمہاری یاد چلے　　باغِ عالم سے نامراد چلے
جب تلک چرخ بے مدار رہے　　یہ فسانہ بھی یادگار رہے

خاک تسکینِ جانِ زار کریں
اب وصیت کریں کہ پیار کریں

نظامؔ

۱۸۲۲ ——— ۱۸۷۲ء

نام سیّد نظام شاہ، تخلص نظامؔ، وطن رام پور۔ فارسی اور عربی سے بقدرِ ضرورت واقف تھے، شاعری سے فطری ذوق تھا، اس سلسلے میں کبھی اپنے پیر و مرشد احمد علی صاحب آحمدؔ سے استفادہ کیا، کبھی شیخ علی بخش بیمارؔ سے اصلاح لی اور آخر میں نواب یوسف علی خاں ناظمؔ والیٔ ریاست رام پور کو اپنا استاد بنا لیا تھا اور نواب صاحب مرحوم بھی ان کو اپنا شاگردِ رشید سمجھتے تھے۔ میر سوزؔ اور جرأتؔ کا انداز بہت پسند تھا۔

آزادمنش اور آشفتہ مزاج آدمی تھے، طبیعت میں رندانہ پن بھی پایا جاتا تھا۔ آخری وقت تک ریاست رام پور سے وابستہ و منسلک رہے۔

۱۸۹۹ء میں قدرتؔ رام پوری نے شمس المطابع مراد آباد سے "کلیاتِ نظامؔ" شائع کیا۔ جس میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ عشق و محبت کے مضامین نظم کرنے میں بڑے مشتاق تھے۔ ادابندی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

محاکات کا یہ بے نظیر شعر اردو دانوں کے دلوں سے نظامؔ رام پوری کی یاد کو کبھی نہ محو ہونے دے گا۔

انتخاب

دمِ مرگ آئے وہ عیادت کو
گیا اجل سے بھی شرمسار ہوا

عادت ہی تکلف سے ہوئی شرم و حیا کی
سوتے ہیں بھی منہ پر سے دوپٹا نہیں اُٹھتا

نہ وہ مانتے ہیں نہ میں مانتا ہوں
سفارش کسی کی، دلاسا کسی کا

نہ ملنے پہ اُس کے تو مرتے ہیں لاکھوں
جو ملتا تو کوئی بھی جیتا نہ ہوتا

غیر کے دھوکے میں خط لے کے مرا قاصد سے
پڑھنے کو پڑھ تو لیا نام مگر چھوڑ دیا

یوں آپ تو کہوں گا نہ رنجش کا ماجرا
پوچھو گے تم تو مجھ سے چھپایا نہ جائے گا

ناداں ہوں میں زاہد جو کروں خوف و خطر آج
جو گزرے گی وہ گزرے گی، کسے کل کی خبر آج
اس پاس کے صدقے کی کہ تمناؤں سے چھوٹے
رنجش نہ اُدھر ہے نہ شکایت ہے اِدھر آج

نامہ بر کچھ تو زبانی بھی تو کہنا اُن سے
میرا مطلب ہے بہت اور رہے تھوڑا کاغذ
کر گئے پُرزے دیئے نامے کے کہتا قاصد سے
ایک کاغذ کے عوض سینکڑوں لے جا کاغذ
نہ وہ لکھ سکتے ہیں کچھ ہم کو نہ اُن کو کچھ ہم
یہ خطر ہے کہ کہیں جائے نہ پکڑا کاغذ

یوں ہم کو نہ دل سے تم بھلاؤ دیکھو کبھی یاد آئیں گے ہم

دن نکلنے تو دو چلے جانا آسماں پر ابھی ستارے ہیں

وہ اشاروں میں اس کا کہنا ہائے دیکھو اپنے پرائے بیٹھے ہیں

آجائے کچھ نہ رحم مرے حالِ زار پر اس واسطے وہ دیکھتے ہی اب اِدھر نہیں

پھر آنا اس کو مشکل ہی دکھلا کے نامہ بر تجھ سے ادا ہو ایسا مرا مدعا نہیں

انکار پہ ہی یہ صبر، نہ اقرار پر یقین یارب پڑی ہے جان مری کس عذاب میں

انداز اپنے دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

اک لطف روز کے ہے سوال و جواب میں
ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ وعدہ وفا نہ ہو
کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بُت ہمیں نظام
ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ
یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائے غیر
اور اُس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ
کوچے سے تیرے اٹھیں تو پھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاں تو دونوں جہاں سے اٹھا کے ہاتھ
پہچانا پھر تو کیا ہی ندامت ہوئی انھیں!
پنڈت سمجھ کے مجھ کو اور اپنا دکھا کے ہاتھ
دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظام
مُنہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

ہم سے نہیں نبھی ہے تو غیروں سے نبھ چکی
صد شکر اس کا عہد ہی ناپائیدار ہے

اب تو سب کا ترے کوچے میں ہے مسکن ٹھہرا
یہی آباد ہے دنیا میں زمیں تھوڑی سی

اے بابِ ہوس کو تو نہ کچھ حوصلہ ہوگا
اچھا ہے جو وہ قصدِ ستم کا نہیں کرتے

۱۸۰۱ ———— ۱۸۷۴ء

میر ببر علی انیسؔ، شاعری اور مرثیہ گوئی ان کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کے دادا میر ضاحکؔ (جو دہلی کی تباہی کے بعد فیض آباد چلے آئے تھے اور پھر اس خاندان کے دوسرے بزرگوں نے لکھنؤ جا کر بود و باش اختیار کر لی تھی) نہایت زندہ دل اور ظریف طبع لوگوں میں سے تھے۔ ولدا میر غلام حسنؔ اپنی مشہور و معروف مثنوی "سحرالبیان" کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ والد، میر مستحسن خلیقؔ اپنے دور کے ایک مشتاق غزل گو اور مشہور مرثیہ نویس تھے۔

میر انیسؔ فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے اس کے بعد لکھنؤ چلے آئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم فیض آباد میں میر نجف علی سے اور لکھنؤ میں مولوی حیدر علی سے حاصل کی۔ تربیت میں ان کی والدہ ماجدہ کا دخل رہا۔ جو ایک نہایت ہی لائق اور دین دار خاتون تھیں۔ شاعری کے سلسلے میں والد ماجد نے رہ نمائی کی ہوگی۔ روایت ہے کہ میر انیسؔ کا ابتدائی رجحان غزل کی طرف تھا مگر پدر بزرگوار نے

دیر و حرم، آئینۂ تکرارِ تمنّا وا ماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

قفس میں، مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

سر پہ ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے — وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں — پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

آتش افروزیٔ یک شعلۂ ایماں تجھ سے
چشمک آرائیٔ صد شہرِ چراغاں مجھ سے

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۱۸۰۶ —— ۱۸۶۹ء

نواب محمد مصطفیٰ خاں، تخلص شیفتہ (اردو) حسرتی (فارسی)

ان کے دادا اولی داد خاں فرخ سیر کے عہد میں کوہاٹ سے ہندوستان آئے اور فرخ آباد میں مقیم ہو گئے۔ والد نواب مرتضیٰ خاں ایک دور اندیش اور صاحب تدبیر لوگوں میں سے تھے اسی بنا پر شاہ عالم کے یہاں بڑے رسوخ تک پہنچے، انگریزوں سے پنجاب میں جاگیر ملی، جہاں گیر آباد (ضلع بلند شہر) کا علاقہ اور جائداد خریدی۔

نواب مصطفیٰ خاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ وقت کے بہترین اساتذہ اور علما سے تعلیم و تربیت حاصل کی، عربی اور فارسی میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے اُردو کے کلام پر مومن سے اور فارسی میں غالب سے اصلاح لی، بتیس ۳۲ برس کے سن میں مکروہات اور ممنوعات سے تائب ہو کر پاکیزہ کی زندگی اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں حج کرنے گئے، واپس آنے کے بعد شعر و شاعری میں کم اور اوراد و وظائف میں زیادہ وقت صرف کرنے لگے۔ شیفتہ کا مرتبہ سخن وری میں اتنا بلند نہیں جتنا سخن فہمی، سخن سنجی اور نقد و نظر میں، ان کے تمام ہم عصر صہبائی، علائی، آزردہ، نصیر، ذوق اور عیش ان کے اس وصف کے معترف اور معرف ہیں۔ حالی اور غالب تو ان کے بہت ہی مداح اور قائل تھے۔

۱۸۵۷ء کے معرکے میں نواب شیفتہ کو بھی طرح طرح کی ذہنی، جسمانی اور مالی اذیتیں اور نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ گھر لٹا، جاگیر ضبط ہوئی، سرمایۂ سخن اور ایک نادر کتب خانہ تلف ہوا انگریزوں کی قید و بند کی سختیاں جھیلیں مگر ہر حال میں صابر و شاکر رہے۔

"گلشنِ بے خار" شیفتہ کی مشہور تالیف ہے، فارسی زبان

میں اُردو شاعروں کا تذکرہ جسے انھوں نے تیس برس کی عمر میں ترتیب دیا تھا، اپنی بعض خوبیوں اور خصوصیتوں کی وجہ سے آج بھی سند اور حوالے کا کام دیتا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے ان کا کلیات : جس میں اُردو، فارسی نظم و نثر سب شامل ہے) طبع ہوا، ۱۹۵۴ء میں لاہور سے بھی اُردو کا دیوان شایع ہو چکا ہے۔

شیفتہ نے غزل کے سوا اور کسی صنف سخن پر طبع آزمائی نہیں کی۔ ان کی زبان صاف اور بامحاورہ ہے، خیالات میں پاکیزگی ہے، سادہ بیانی، متانت، اخلاق و تصوف اور بلند مضامین ان کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔

انتخاب

دیکھتے ہم بھی کہ آرام سے سوتے کیوں کر ‎ نہ سُنا ہائے کبھی تم نے فسانا دل کا

ہم سے پوچھتے ہیں کہ اسی کھیل میں کھوئی ہے عمر ‎ کھیل جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا

خوبیِ بخت کہ پیمانِ عدو ‌ٹوٹا ‎ اس کو ہنگام قسم یاد آیا!

دو قدم ایاں سے وہ کوچہ ہے مگر ‎ نامہ بر صبح گیا شام آیا

شیفتہ ضبط کرو، ایسی بھی کیا بے تابی
جو کوئی ہو، تمھیں احوال سنانا دل کا

کون کہتا ہے کہ ظلمت میں کم آتا ہے نظر
جو نہ دیکھا تھا سو ہم نے شبِ ہجراں دیکھا

دامن تک اس کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا

حسرت سے اُس کے کوچے کو کیوں کر نہ دیکھیے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

کس پیے لطف کی باتیں ہیں پھر   کیا کوئی اور ستم یاد آیا

یاس سے آنکھ جو جھپکی تو توقّع سے کھلی
صُبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

یاد نے جس کی بُھلایا سب کو   اس کی میں یاد بھلاؤں کیونکر

اے تابِ برق، تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز

دل کا گلہ، فلک کی شکایت یہاں نہیں
وہ مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں

اس نو بہارِ حسن کو بدنام مت کرو　　تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں　　گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
آخر جہاں میں شب تاریک بھی تو ہے　　اچھا نہ آئیں آپ شبِ ماہتاب میں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

ہر شکوے سے ٹپکے ہے ادا ناز تو دیکھو
ہر بات میں اک بات ہے انداز تو دیکھو

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں، پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے

ناصح تری زباں، ترے بس میں جب نہ ہو
انصاف کر کے دل پہ مرا زور کیا چلے

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہلِ مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

تذکرہ صلح کا کرو، نہ کرو بات اچھی نہیں لڑائی کی
دل لگایا تو ناصحوں کو کیا؟ بات جو اپنے جی میں آئی کی

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

شوق

۱۷۸۲ ——— ۱۸۷۱ء

نام تصدق حسین خاں، تخلص شوق، شاگرد آتش، نسباً پٹھان، نواب مرزا یا حکیم نواب مرزا کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ ان کے والد آغا علی خاں کا شمار لکھنؤ کے مشہور طبیبوں میں سے تھا۔ ان کے چچا مرزا علی خاں شاہانِ اودھ کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز

تھے۔ "حکیم الملک" ان کا خطاب تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ اس کے بعد طب پڑھی، علوم متداولہ اور مروّجہ فنون سے بھی بقدر ضرورت واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ تو اپنا آبائی پیشہ طبابت اختیار کیا اور نہ کہیں ملازمت کی۔ گھر میں باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت اتنی تھی کہ لطف و فراغت کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔

شوقؔ پیدائشی طور سے رنگین طبع اور موزوں سرشت تھے اس پر طرہ یہ کہ ان کے چاروں طرف شاعرانہ ماحول اور اس کی پرورش کا پورا پورا سامان و اہتمام موجود تھا۔

منسوب تو ان سے بہت سی مثنویاں ہیں مگر ان کے نام کو باقی رکھنے والی "فریبِ عشق"، "بہارِ عشق" اور آخری شاہ کار "زہرِ عشق" کو سمجھنا چاہیے۔ ان ہی مثنویوں کی بدولت وہ بدنام بھی ہوئے اور آج یہی مثنویاں ان کی نیک نامی، قادرالکلامی، وقعت اور شہرت کا سبب بھی سمجھی جاتی ہے۔

بہت دنوں تک شوقؔ کا ذکر نامسموع اور ان کی مثنویوں کا پڑھنا ممنوع رہا۔ لیکن اب یہ بات مسلّم ہو چکی ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی اپنی ہوس ناکی یا لذت پرستی کی داستان نہیں بلکہ اُن مشاغل و افکار کی وہ کامیاب عکاسی ہے جس میں اُس دور کے بیشتر خواص اور متوسط طبقے کے اہالیانِ لکھنؤ روز و شب مبتلا و مصروف رہا کرتے تھے۔

شوقؔ کی عظمت اور ان کے کمالات کا اس سے بڑھ کر اور

مرثیہ گوئی کو توشۂ آخرت خیال کر کے اس کی طرف متوجہ کیا اور پھر سعادت شعار فرزند نے جو اس میدان میں قدم رکھا تو واقعہ یہ ہے کہ اس صنف کو معراج تک پہنچا دیا۔

اُردو میں رزمیہ شاعری کی جو کمی تھی وہ میر انیسؔ کی بدولت حُسن و خوبی کے ساتھ پوری ہوئی۔ باوجود اس کے کہ مرثیے کا موضوع محدود اور اس کا مسالا ایک مخصوص فرقے کے اعتقادات پر مبنی ہے لیکن میر انیسؔ نے اسی محدود اور مخصوص ضمن اور صنف میں منظر کشی، جذبات نگاری، سیرت و کردار کی مصوری، سلاستِ بیان، روانی و شگفتگی، فصاحت، صنائع و بدائع کا جیسا حسین ترین استعمال اور بلاغت کے اصل معیار اور اس کی صحیح تعریف کا جو استادانہ لحاظ و اہتمام کیا ہے اُن سب میں اُن کا مدِ مقابل مشکل ہی سے نکل سکے گا۔ الفاظ کا جو زبردست خزانہ میر انیسؔ کے قبضے میں تھا اور ان کو جس اعتماد اور سلیقے سے وہ کام میں لائے ہیں کہیں اور اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ اُردو زبان پر تو وہ مستند طور پر قادر تھے ہی اسی کے ساتھ فارسی، عربی۔ فنون سپہ گری اور علم نفسیات کے بھی وہ بڑے ماہر اور مبصّر تھے۔

پرہیز گاری، خودداری، وضع داری اور پابندیٔ اوقات بھی ان کے اوصاف اور کردار کی نمایاں خصوصیتیں رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرؔ صاحب مغفور نے تقریباً دو لاکھ شعر کہے نول کشور پریس لکھنؤ اور نظامی پریس بدایوں سے ان کے مرثیوں کی کئی کئی جلدیں شایع ہو چکی ہیں پھر بھی ابھی بہت سا کلام اُن کا غیر مطبوعہ ہے۔

کاٹے کبھی قدم، کبھی بالائے سر گئی　　ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

دل میں بدی، طبیعتِ بد میں بگاڑ تھا　　گھوڑے پہ یہ تماشتی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

فرما سکے نہ یہ کہ سگِ مشرقین ہوں　　مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

سلام

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو　　ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم　　انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
غلط یہ لفظ، وہ بندش بُری، یہ مضموں سست　　ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

انیسؔ دم کا بھروسا نہیں، ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

رباعی

نا فہم سے کب دادِ سخن لیتا ہوں　　دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
چھلنی نہیں ہو گئے دوستاں یک رنگ　　کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے　　وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی　　جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

دبیرؔ

۱۸۰۳ ——— ۱۸۷۵ء

مرزا سلامت علی دبیرؔ ابن مرزا غلام حسین، شاگرد میر مظفر حسین ضمیرؔ، مرزا صاحب موصوف کے جدِ اعلیٰ مُلّا ہاشم شیرازی شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے تھے، دبیرؔ دہلی میں پیدا ہوئے، چھ سات سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آگئے تھے اِسی شہر کے نامور علماء سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، شعر و سخن سے قدرتی مناسبت تھی، پندرہ سال کی عمر سے مرثیہ گوئی شروع کر دی تھی، اپنی ذہانت اور طباعی کی بدولت اوائل عمر ہی سے شہرت و مقبولیت کے درجے پر پہنچے تھے، بادشاہ وقت کے سامنے مرثیہ پڑھنے کا فخر و اعزاز حاصل ہوا، لکھنؤ کے بعض رؤسا اور محلاتِ شاہی ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتی تھیں۔

لیاقتِ علمی اور استعدادِ فن کے ساتھ ساتھ آداب و مراتب

کا بے حد لحاظ رکھتے تھے، تہذیب و متانت کا بھی مکمل نمونہ تھے۔ مرثیہ گوئی کے فن اور صنف کو اُن کی ذات سے بڑا عروج اور استحکام حاصل ہوا۔ وہ مرثیے جو اُن سے پہلے بیس تیس بند سے آگے نہیں بڑھتے تھے ان کو دو ڈھائی سو بند تک پہنچایا۔ شوکتِ الفاظ، مضمون آفرینی، بلند خیالی، بلیغ استعارے، نادر تشبیہیں، غم انگیز واقعات کا دل گداز اندازِ بیان، تمام جزدیات اور تفصیلات کو قلم بند کر دینے پر یکساں دسترس، بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر ایک کے جذبات اور احساسات کی پر اثر ترجمانی، بین و بکا کے مضامین، غرض مرثیے کی تمام خوبیاں اور خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں بکثرت اور بالالتزام پائی جاتی ہیں۔

پچاس ساٹھ سال تک کی مسلسل مشقِ سخن میں کم و بیش تین ہزار مرثیے لکھے ہوں گے اس کے علاوہ بے شمار نوحے اور ہزار ہا رباعیاں بھی ان کی یادگار ہیں۔

انتخاب

کیا دھوپ ہے کیا تابشِ خورشیدِ فلک ہے
سایہ اسی گرمی سے سیہ آج تلک ہے

اُٹھی، گری، بلند ہوئی، پست ہو گئی
پی پی کے مے کشوں کا لہو مست ہو گئی

جانے میں شبِ وصل کی ساعت نظر آئی
آنے میں یہ عاشق کی طبیعت نظر آئی

اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب
لرزندہ و شرمندہ و درماندہ و بے تاب
خورشید و سحاب و فلک و انجم و مہتاب
سوزان و خروشان و سراسیمہ و بے خواب

یاں بخت وہاں عمر، اِدھر عقل، اُدھر ہوش
خوابیدہ و برباد و پراگندہ و روپوش
یاں ناطقہ، واں حافظہ خاموش و فراموش
بے نور اِدھر چشم، تو بے بہرہ اُدھر گوش

گُل پیرہن و گُل بدن و گُل رخ و گُل فام
شمشاد قد و غنچہ دہان و سمن اندام
خوش قامت و خوش رو، و خوش آغاز و خوش انجام
حُسنِ چمنِ شرع، بہارِ گلِ اسلام

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفا
لے تو چلا ہوں فوجِ عمر سے کہوں گا کیا
نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا
منت بھی گر کروں گا تو وہ دیں گے کیا بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال یہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمھارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

پھیر مونٹ بے زباں کے جو سے حجت کا کے سر رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر!
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر سیکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر!
پھیری زباں لبوں پہ جو اُس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

ظہر تک سب رفقا شاہ کے مقتول ہوئے تھے وہ مقبولِ خدا اور بھی مقبول ہوئے
یک قلم صرفِ خزاں فاطمہ کے پھول ہوئے رو بہ قبلہ شہ دیں شکر میں مشغول ہوئے
رو کے کہتے تھے کہ اکبر نہیں عباس نہیں
اب امانت کوئی خالق کی مرے پاس نہیں

اب نہ قاسم مرا جیتا ہے نہ اکبر باقی نہ علم دار سلامت ہے نہ لشکر باقی
بھانجے ہیں نہ بھتیجے نہ برادر باقی اب فقط سر مرا باقی ہے اور اصغر باقی
قتل اصغر ہو، مرا سر بھی جدا ہو جائے
اس امانت سے بھی شبیر ادا ہو جائے

یا خدا تجھ پہ ہیں صدقے، مرا لشکر بھی نثار دل فدا، جان فدا، روح فدا، سر بھی نثار
علی اکبر بھی نثار اور علی اصغر بھی نثار تجھ پہ باقر بھی فدا عابدِ مضطر بھی نثار
میں نے جو کچھ ترے دربار سے پایا مولا
سب تری راہ میں خوش ہو کے لٹایا مولا

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بارِ خدا ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطرِ عاشقِ جاں باز ہے البتہ جدا اے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا
حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلاد رہے
لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے

بندہ پرور! میں ہوں اک عبدِ غریب و احقر
بے کس و بے وطن و بے پدر و بے مادر
منزلِ ملکِ عدم میں تو مرا ہو رہبر
نہ تو اس راہ سے آگاہ نہ منزل کی خبر
شوق بھی رعب بھی مجھ کو تری درگاہ کا ہے
سامنا بندۂ ناچیز کو اللہ کا ہے

رباعی

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں
منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل
اس واسطے کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

عیشؔ دہلوی

۱۷۸۴-۵ ——— ۱۸۷۹ء

نام آغا جان، تخلص عیشؔ، اسلاف کا وطن بخارا، وہاں سے یہ لوگ کشمیر آئے اور پھر دہلی آکر آباد ہو گئے۔ ان کے والد عیسیٰ خاں اور دادا عبدالشکور خاں اپنے وقت کے اچھے حکیموں میں سے تھے۔ وہی طبابت کا پیشہ ان کو بھی ورثے میں ملا تھا۔ ماں باپ کی سب سے بڑی اولاد یہی تھے اور انھیں کی ذات سے ان کے خاندان کا نام باقی اور مشہور رہا۔ دہلی کے کوچۂ چیلاں میں "چھتّا حکیم آغا جان" اسی کا ثبوت ہے۔

حکیم صاحب کی زندگی تین کاموں میں گزری، طبابت، شاعری اور عبادت۔ فارغ البالی سے رہنے کے سامان بھی ان کو خوش قسمتی سے برابر میسر رہے۔ نواب جھجھر کے یہاں ملازم تھے وہاں آنا جانا ضروری نہ تھا مگر تنخواہ ملتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ شاہ رخ مرزا کے یہاں سے وظیفہ مقرر تھا۔ بادشاہ کے حکم سے مرزا فرخندہ شاہ کی سرکار سے منسلک ہو گئے۔ ملنا ملانا تو یہاں سے واجبی ہی سا تھا مگر قلعے سے تعلق بڑھانے اور شاہی طبیب کے منصب تک پہنچنے میں بہرحال یہ سلسلہ کام آیا۔ جب شاہی طبیب ہوئے تو قلعے سے ایک دن نافہ کرکے سواری آجاتی تھی، تھوڑی دیر کے لیے گئے، کسی کو نبض دکھانا ہوئی تو دیکھ لی ورنہ مجرا عرض کیا اور گھر واپس آئے۔

صبح سے دوپہر تک مطب میں بیٹھتے، ضرورت ہوئی تو شام کو بھی۔ اس کے بعد کا وقت شعر و شاعری اور عبادت گزاری میں صرف ہوتا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں گیارہ بجے رات کو بس ایک بار کھانا کھاتے تھے۔ عمر بھر یہی معمول رہا۔ وجیہہ، توانا اور تن درست آدمی تھے۔ تقریباً اٹھانوے سال زندہ رہے، آخری وقت تک قویٰ مضبوط اور حواس برقرار رہے۔

شاعری میں حکیم صاحب مجرم کے شاگرد تھے، اور مجرم کو تلمذ تھا بیدار سے اس طرح یہ سلسلہ میر درد تک پہنچ جاتا ہے۔ مرنے کے بعد دفن بھی دادا پیر کے پائنتی ہوئے۔

عمل اور عقیدے کے لحاظ سے وہ ایک مذہبی آدمی تھے۔

شعر و شاعری میں ہم عصروں سے نوک جھونک اور چوٹیں رہا کرتی تھیں میر کو چھوڑ کر باقی نہ غالب کی مشکل پسندی ان کو گوارا تھا نہ مومن کی اختر شناسی کے قائل تھے اور نہ لکھنؤ والوں کی زبان دانی کے دعوے کو خاطر میں لاتے تھے۔ ع مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے غالب کے بارے میں اس طرح سے کہہ دینا معمولی جرأت وجسارت والے آدمی کا کام نہیں تھا۔ ایک طرف یہ انداز و کیفیت دوسری طرف جب لکھنؤ پر تباہی آئی اور اس کا سہاگ لٹا تو اس کا سوگ بھی انھوں نے منایا اور جب تک جیے اس غم کو بھلا نہ سکے۔ غالب کے نکتہ چیں تھے مگر ان کے مرنے پر تاریخ وفات نظم کی ان کی خوش دلی کی تعریف کی، مغفرت کے خواہش مند ہوئے اور بہترین تمناؤں کے ساتھ ان کو یاد کیا۔

حکیم صاحب نے دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے، پہلے دیوان میں جوانی، جسارتوں اور خوش وقتیوں کا کلام ہے اور دوسرے میں ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے حالات اور سانحات پر رنج و ملال کا اظہار۔

مجموعی حیثیت سے کلام کی خوبیوں اور خصوصیتوں پر مختلف رائیں قابل لحاظ ہیں۔ مرزا قادر بخش صابر نے لکھا ہے: "کلام صنائع لفظی سے آراستہ ہے، غزل میں محاورے اور شستگی زبان کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔" مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں: "... یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو زبان کو مانجھا ہے اُس میں روانی پیدا کی ...." مرزا فرحت اللہ بیگ کو اُن کے کلام میں دو چیزیں خاص

طور سے پسند آئیں ایک قصیدہ دوسرے پہیلیاں"۔ انھیں کا ایک قول اور بھی ہے کہ "شعر میں محاورہ ایسا بٹھاتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ......"

انتخاب

ہستی کا حال اپنی بھلا تم سے کیا کہیں — دنیا میں آکے دیکھ گئے ایک خواب سا

عشق اور مشک چھپائے سے کہیں چھپتا ہے
دردِ دل لاکھ چھپایا، پہ چھپایا نہ گیا

کیا جس کو ترک اُس سے پھر کام کیا — کہ چھوڑے ہوئے گاؤں کا نام کیا

عاشق جسے کہتے ہیں وہ پیدا نہیں ہوتا — اور ہووے بھی بالفرض تو مجھ سا نہیں ہوتا

پھاڑ دامن مرا، تو خارِ بیاباں اچھا
منع کرتا نہیں میں شوق سے ہاں ہاں اچھا

دل مرا، صرفِ تمنا ہو چکا — لو جی بس یہ بھی جھگڑا ہو چکا

اک قدم وحشت میں اُٹھا تھا کہ عشق — دیکھتے کیا ہیں کہ صحرا ہو چکا

جامِ گُل بادۂ عشرت سے جو لبریز ہے آج
چہچہا کرتی ہے بُلبُل کہ نشہ تیز ہے آج

بس آب ودانے کی یہ خوبیاں ہیں سب ورنہ
کہاں میں اور کہاں دام اور کہاں صیّاد

کیوں نہ چھپائیں کیا اجارہ ہے کسی کا ہمنشیں
دے دیا ہے اپنا دل اُس بُت کو ہاں ہاں دیکھ کر

ترا بیمار جو سنبھلا نہ سنبھالا لے کر   چپکے ہی بیٹھے رہے دَم کو مسیحا لے کر

قافلے والوں سے کہہ دو تم چلو   ہم بھی آتے ہیں کوئی دم ٹھہر کر

آپ کے لطف وعنایت کا بھروسا کیا ہو
کہ گھڑی بھر میں اگر ہے تو گھڑی بھر میں نہیں

کس مُنہ سے ہم کریں گے بھلا یار کا گلہ   ہم کو تو عیشؔ شکوۂ اغیار بھی نہیں

گردش ہے اُس کی چشم کو مستی میں کیا کہیں
نرگس کا پھول تیر رہا ہے شراب میں

عیش ہم کوچۂ قاتل میں فقط　　　سر فروشی کے لیے بیٹھے ہیں

کہا جو رحم مرے حال پہ ذرا کھاؤ　　　تو ہنس کے بولے کہ جلتے نہو، ہوا کھاؤ

ہے زلف سے مکھڑے پہ طلسمات کا عالم
گر چھوڑیں تو ہو شام، اُٹھا دیں تو سحر ہو
ہے تیرے مریضِ غمِ ہجراں کی یہ حالت
مانگیں ہیں دُعا سب یہ اِدھر ہو کہ اُدھر ہو

اے شمعِ صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

شغل کچھ چاہیے بہلانے کی خاطر دل کے
گر نہیں وصل کی امید چلو یاس تو ہے

سنیے جو ہزار کچھ سنائے　　　کیجے وہی جو سمجھ میں آئے

جانؔ صاحب

۱۸۱۸-۱۹ ——— ۱۸۶۹ء

میر یار علی نام، جانؔ (صاحب) تخلص، والد کا نام میر امن، فرخ آباد میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے تھے، ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر کہنے کے لیے جو استعداد اور صلاحیت چاہیے وہ ان کے یہاں پوری پوری موجود تھی، نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے، شاعری کے علاوہ بنوٹ کے فن سے بھی واقف تھے۔ مخصوص طرزِ سخن کی بنا پر مرتے دم تک مشہور و مقبول رہے اور آج بھی لوگ انھیں خصوصیتوں کے تحت ان کو جانتے اور یاد کرتے ہیں۔ دیوان دو بار ان کی زندگی ہی میں چھپا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے باوجود مالی پریشانیوں نے بھی آخر دم تک ساتھ نہ چھوڑا، ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی اور بھوپال کے چکر بھی لگائے تھے۔ کام نہ بنا تو پھر لکھنؤ واپس آگئے۔ مٹی رامپور کی تھی، وقت کے بعض مشہور عالموں اور شاعروں کی طرح نواب کلب علی خاں کی سرپرستی اور ان کی ریاست کے وظیفے سے کچھ دن یہ بھی فیض یاب ہو لیے۔

ریختی کے معاملے میں جانؔ صاحب کی مستقل مزاجی اور

جی بھر کے ریختی کو اپنائے رہنا قابل داد ہے۔ اس سے پہلے رنگین اور انشا بھی اس طرف رجوع ہو چکے تھے مگر صرف تفنن طبع کی خاطر، جان صاحب کے بعد بھی ریختی گوئی کا رواج رہا مگر اس اُستادی اور استحکام کے ساتھ نہیں۔ جان صاحب کا کلام ہر صنف میں موجود ہے ایک کامیاب اور خوش فکر شاعر کی طرح اپنے دور کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیاں بھی ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ جان صاحب کی یہ ایک ناقابلِ فراموش خدمت ہے کہ اُن کی بدولت بیگماتی زبان کا ایک مخصوص اور کمیاب سرمایہ محفوظ ہو گیا ہے۔ چونکہ انھوں نے بحیثیت مجموعی ہر طبقے کی عورت کے خیالات، جذبات اور مشاغل و افکار کی عکاسی و ترجمانی کی کوشش کی ہے اس واسطے ان کے شعروں میں بعض ناپسندیدہ باتیں بھی آگئی ہیں۔ اس سے قطع نظر ان کے یہاں بلند پایہ مضامین اور لطیف جذبات کی بھی کمی نہیں ہے۔ معقول اور شائستہ انداز کے شعر بھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔

جان صاحب نے شعر گوئی کے لیے عورتوں کی زبان ضرور اپنائی اور پڑھتے وقت عورتوں کے سے انداز و اطوار اور لب لہجہ بھی اختیار کر لیا کرتے تھے جسے ان کی حُسنِ اداکاری سے منسوب کرنا زیادہ مناسب ہوگا، کبھی کبھی لطفِ محفل کی خاطر مشاعروں یا دربار میں ان کے سر پر دوپٹا بھی ڈال دیا جاتا تھا باقی اس کے علاوہ رہن سہن، لباس اور وضع قطع میں اپنے دور کے شریف، ثقہ، اور مہذب قسم کے مردوں کے طور طریقوں کے ہمیشہ پابند رہے۔

سیرت و کردار میں کہیں سے بھی زنانہ پن یا نسائیت کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔ زندگی کے آخری دن زیادہ تر عبادت گزاری میں بسر کیے۔

انتخاب

سوتے ہیں اب وہ چین سے مخمل کے فرش پر
گھٹتا ہوا نصیب نہ جن کو پیال کا

گرگٹ کی طرح کالا کبھی لال ہو گیا
غصے سے مردوے کا عجب حال ہو گیا

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت
سر پہ جو کوئی چاہنے والا نہیں ہوتا

کھانا چُرا کے خوب نہیں ماں سے پان کا
منہ کی کہیں کھلائے نہ چسکا زبان کا

کھلا جنگل میں آ کے حال ان چڑیوں کی چوں چوں کا
ہر اک عاشق کو دیتی ہیں یہ پُرسا اپنے مجنوں کا

دل لے کے رنج دے گا سراسر کسی کو جو
بی اپنے دیدے گھٹنے کے آگے وہ پائے گا

سوکن نے پائجامہ پہنا ہے گُل بدن کا
پھولوں میں تُل رہا ہے کانٹا مرے بدن کا

خدا غنی ہے حقیقت میں اور کل ہیں فقیر   کسی کو رکھتا نہیں ہے خدا سدا محتاج

مٹتا نہیں کسی کا مٹائے سے جان لے   پیشانی پر جو لکھ چکا پروردگار خط

جو کہ معشوق کا مذہب ہے وہ ہے عاشق کا
حق تو یہ بات ہے کافر ہے نہ دیں دار ہے عشق

منہ زرد آنکھیں لال پھٹے کپڑے جی اداس
عاشق کے بوجھنے کے یہ ہیں چار رنگ

وہاں آٹے کا سنو ہو جاوے اس دم گھاٹا   چاہنے والے اجی جب کہ بچھڑ جاتے ہیں

لاکھ تدبیر کرو ایک نہیں بنتی ہے   دن مقدر کے جب اے جان بگڑ جاتے ہیں

ناحق نہ کرو پاس تم اس کا مرے بھیا   ماں باپ کا ہے مرتبہ جورو سے زیادہ

منہ سے تو کچھ کہیں یہ کریں ناکار کچھ   مردوں کی بات کا نہیں ہی اعتبار کچھ

دیکھیں جو اپنی چوٹی کی پرچھائیں رات کو
رسی سمجھ کے بھاگی ہیں اک چیخ مار کے

اور کیا بھبتی کہوں بن آئے ہو لنگور سے
داڑھی منڈوائی ہیں باز آئی خدا کے نور سے

بی بنا آتی ہے بگڑی ہوئی تقدیر کیسے
اچھی سوجھی ہے بُرے وقت ہیں تدبیر کیسے

اک چُپ ٹالتی ہے لاکھ بلا　　میں نہ بولوں کوئی ہزار اُلجھے

بُرا نہ کہتی کسی کو تو کیوں بُرا سُنتی　　خراب کرتی ہے خود مجھ کو یہ زبان میری

چڑھ کے منبر پہ عبث او ہی بھری محفل ہیں
واعظو مغز یہ کیوں کرتے ہو اپنا خالی

کیا ریختی کہہ کہہ کے کیا نام ہے پیدا
اے جان ترا عیب بھی بہتر ہے ہنر سے

سالک

۱۸۲۴ــــــــ۱۸۸۱ء

نام مرزا قربان علی بیگ خاں، پہلا تخلص قربان اس کے بعد

سالکؔ، قوم ازبک ترک، اجداد کا وطن دہلی۔ ان کے والد مرزا عالم بیگ خاں ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے، وہیں یہ پیدا ہوئے۔ ملازمت کی مدت پوری کرکے جب عالم بیگ خاں دہلی واپس آگئے اس وقت سالکؔ چھے سال کے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما دہلی ہی میں ہوئی۔

تعلیم سے فراغت پاتے ہی ریاست الور میں ملازم ہوگئے۔ جب وہاں سے الگ ہوئے تو حیدرآباد جاکر برسرِکار اور مقیم ہوگئے۔

محکمہ تعلیمات میں ملازمت کے ساتھ ساتھ، سالکؔ نے حیدرآباد سے نواب عماد الملک کی سرپرستی میں رسالہ "مخزن الفوائد" بھی جاری کیا۔ اور بہت دنوں تک اس رسالے کے ذریعے علم و ادب کی معقول خدمت انجام پاتی رہی۔

سالکؔ کا انتقال بھی حیدرآباد میں ہوا، اور وہیں مدفون ہوئے۔

بیشمار ۱۸ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ پہلے مومنؔ سے اصلاح لی، اس کے بعد غالبؔ کی طرف رجوع ہوگئے۔ مرزا ہی کے مشورے سے سالکؔ تخلص اختیار کیا تھا۔

شگفتہ رُو اور خوش مزاج لوگوں میں سے تھے۔ ذہانت و ذکاوت، سخن سنجی اور سخن فہمی میں بھی ممتاز تھے۔ اسی بنا پر استاد کی نگاہ میں ان کا مرتبہ بلند اور ساتھیوں اور ہم عصروں میں ان کی حیثیت اہم اور وقیع تھی۔

غالب کی وفات کے بعد اُن کے بہت سے نوآموز اور کم مشق شاگرد بھی انھیں سے اصلاح لینے لگے۔

شاعری کے علاوہ سالک کو شطرنج سے بھی بڑا شوق تھا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ دو دیوان "نجارِ سالک" اور "مے خانۂ سالک" شائع ہوئے تھے مگر اب دونوں نایاب ہیں۔

سالک اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب تھے کہ ان کو دو بے مثل اور مایہ ناز استادوں کی رہنمائی حاصل کرنے اور اصلاح لینے کا شرف حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں مومنؔ کی رنگین بیانی اور غالبؔ کی ندرت آفرینی اپنے موقعے پر جلوہ گر ہے۔

انتخاب

ناچار ہوا وادیٔ محشر کو روانہ
جس فتنے نے پایا نہیں رستہ مرے گھر کا

یوں عمر گزاری تری فرقت میں کہ ہر دم
جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا

انسان ہوس پیشہ ہے کیا ہو نہیں سکتا
مجبور ہے اس سے کہ خدا ہو نہیں سکتا

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی
بے وفا! تو بھی اسے لے کے پشیماں ہوگا

تم غیر کے ہوئے، تو رہا کیا جہاں میں — گویا ہمارے واسطے کبھی کچھ بنا نہ تھا

میرا ہو آشیانہ اور آدھا جلا ہوا — بجھ بھی گئی تھی آگ، تو بجلی کو کیا ہوا

کہا مانے ہو کیوں وعدہ فراموش جہاں میں — آجاؤ کہ میں آپ میں اکثر نہیں ہوتا

کچھ ہو پر ان کو جانب اغیار دیکھنا — اک بار منع کیجے تو سو بار دیکھنا

نہیں اک بار بھی اب سُننے کی طاقت دل میں — پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا

اپنی ستم کشی کا مجھے امتحاں ہے اب — درکار ایک اور نیا امتحاں ہے اب

کس کو دل دیتے ہو کیا کرتے ہو دیکھو سالکؔ
ہائے ناداں بنے جاتے ہو، دانا ہو کر

تم آ گئے تو ہوش کہاں میزباں ہو کون — آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم
بایں ہمہ وہ نا امید ہیں، کیا مدعا سے ہم — کہتے ہیں اور کہتے ہیں، کس التجا سے ہم

پھرتے ہیں دادخواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں، تو کوئی پوچھتا نہیں

وہ دشمن، دوست ہو یا آسماں ہو اجل بن کر ہی کوئی مہرباں ہو

شکر کیجے کہ نہیں تابِ تکلّم مجھ کو ورنہ اس طرح بھی، جو چاہو کہو تم مجھ کو

رگ رگ میں نیشِ عشق ہے، اے چارہ گر مرے
یہ درد وہ نہیں کہ کہیں ہو، کہیں نہ ہو

تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ تن درستی ہزار نعمت ہے

جانے دے اے تصورِ جاناں نہ کر تلاش
ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دشمن کے گھر ملے

پہنچے عدو کے گھر میں تو دامن جھٹک دیا
ہم خاک بھی ہوئے ہیں تو مٹی خراب ہے

زباں کٹ جائے، گر لب سے تمہارا کچھ گلہ نکلے
مگر یہ تو کہوں گا، ہم کو کیا سمجھے تھے کیا نکلے

اس کے آنسو ٹپک پڑے سالکؔ حال اس درد سے کہا تو نے

صیاد اور بندِ قفس سے رہا کرے جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے

ممنونؔ

متوفی ـــــ ۱۸۴۴ء

میر نظام الدین نام، ممنونؔ تخلص، ان کے والد میر قمر الدین مِنّتؔ اپنے وقت کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے ایک مشاق اور پُر گو شاعر تھے۔ ان کا وطن سونی پت تھا۔ شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ دہلی آکر بود و باش اختیار کر لی تھی، ممنونؔ کی نشو و نما بھی دہلی ہی میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور شعر گوئی کا شوق ہوا تو اصلاح بھی انھیں سے لینے لگے تھوڑے ہی دنوں کی مشق سخن میں دہلی کے سخن سنجوں اور سخن وروں میں اپنا نام پیدا کر لیا بلیاقت کا شہرہ سُن کر محمد اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے اپنی استادی کا شرف بخشا۔ اور "فخر الشعرا" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اس قدر افزائی کے بعد پھر بہت سے لوگ اُن کی شاگردی کے زمرے میں شامل ہوتے رہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مفتی صدر الدین آزردہؔ نے بھی اپنے کلام پر ان سے اصلاح لی۔ اسی شہرت اور نام وری کے دور میں لکھنؤ پہنچے، وہاں بھی اودھ کی سرکار کی طرف سے ان کا خیر مقدم ہوا اور خاصی مان دان رہی۔ حکومت برطانیہ نے ان کو اجمیر کا

صدرالصدور مقرر کر کے اُن کی جاہ و عزت میں مزید اضافہ کیا۔ مدت تک اس بڑے عہدے پر فائز رہے، بالآخر جب ضعیفی بڑھنے لگی تونیک نامی کے ساتھ اپنے ان مراتب اور ذمے داریوں سے سبک دوش ہو کر دہلی آگئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ ضخیم اور مرتب شکل میں ایک دیوان موجود ہے۔

تذکرہ نگار اور نقاد اس پر متفق ہیں کہ ان کا کلام صاف، رواں اور شیریں ہے، مزے دار محاوروں، خوب صورت ترکیبوں، اور چست بندشوں سے انھوں نے خوب خوب کام لیے ہیں، تغزل اور تصوف دونوں رنگ کے شعر اپنی اپنی لطافتوں اور خوبیوں کے ساتھ کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ استادی اور کہنہ مشقی کی بدولت بعض فرسودہ مضامین کو بھی سلیقے اور ندرت کے ساتھ نظم کر گئے ہیں۔

انتخاب

اے آہ بے ادب نہ اسے چھیکیو کہ ہے
دل جلوہ گاہ پردہ نشینانِ راز کا

اُس کی آنکھوں سے ستاروں کی نمک ریزی پوچھ
صُبح تک جس کا کھلا دیدۂ بے خواب رہا

تجھے نقشِ ہستی مٹایا تو دیکھا
جو پردہ تھا حائل اُٹھایا تو دیکھا

الٰہی جیب کہ دامن کہ آستیں دھوؤں
مژہ نے سیکھ لیا رنگ خوں فشانی کا

دل میں جو جو ہے نکالیں وہ ذرا بول کے خوب
آج اس شوخ سے لڑ لیجیے دل کھول کے خوب

آمد سے تری ہم یہ جو ہونی تھی سو ہو لی　　اب وعدۂ حشر نہ پروائے قیامت

ہے سایہ فگن زلفِ سیہ فام زمیں پر　　یا زلف قیامت کی ہے یہ شام زمیں پر

شبِ وعدہ جشیم ہے راہ پہ جو ذرا بھی کھٹکے کسی کا در!
تو صدا کرے یا تری جان کر کہوں اب تلک تجھے کہاں! کدھر!

اپنا غبار بھٹکے ہے مانندِ گردِ باد　　گو ہو گئے ہیں خاک پہ ہے جستجو ہنوز

اس ذوق سے کہتے ہیں حدیثِ لبِ شیریں　　گویا ترے ہونٹوں ہی سے لیتے ہیں مزا ہم

ہے تیری بوئے عطرِ گریباں سے مست ہا گُل
گُل ہے چمن چمن سے ہوا، اور ہوا بنے ہم

اس مرگ پہ سو جاں مری صدقے کہ دمِ نزع
گھبرا کے کہے تو کہ اس اب دیکھیے کیا ہو

رات تھوڑی ہے مسترنیں یا دل بہت　　صلح کیجے بس لڑائی ہو چکی

مکتب میں بھی سبق تھا الف لام میم کا
طفلی ہی سے ہوا ہیں خوگر، الم کے ساتھ

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنوںؔ
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

بھری آتی ہے چھاتی، یاد میں یارانِ رفتہ کے
یہ دل اور اس قدر صدمے بھلا کس کس کا غم کیجے

کرنے نہ پائے نیم تبسّم کہ بس چلے
جوں غنچہ، رنگِ گلشنِ ہستی پہ ہنس چلے

غمزے کو پھر ہیں کاوشیں، اِس دلِ پاش پاش سے
قطرہ خوں ہے وہ بدُو، دشنہ جاں خراش سے
وصل میں بھی نگاہِ شوق، تا مژہ، یاں نہ آسکی
عشوے کے اہتمام سے، غمزے کی دور باش سے
حسرت و یاس و رنج و غم، محنت و غصّہ، درد و سوز
خانہ دل کو آئے ہیں ڈھونڈھ کے سو تلاش سے

وحید

۱۸۲۹ ——— ۱۸۹۲ء

نام' وحید الدین، تخلص' وحید' وطن کرڑا (ضلع الہ آباد) زیر پرورش، ان کے والد مولوی امیر الدین' الہ آباد میں وکالت کرتے تھے' نہایت خوش اخلاق اور فیاض آدمی تھے' ہر حلقے میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

وحید کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت اور ماحول کی رعایت سے انھوں نے اپنا بچپن نہ تو تنگی اور عسرت میں گزارا اور نہ جوانی میں وہ زاہد خشک بن کر رہے۔ راگ رنگ سے شوق تھا اور عشق و عاشقی سے لگاؤ۔ انھیں راہوں سے گزر کر بالآخر وہ تصوف کی منزل تک جا پہنچے۔ منکسر المزاج اور رمرنجاں مرنج قسم کے لوگوں میں سے تھے' نوک جھونک، تلخی ترشی، طنز و ہجو سے نہ کبھی زبان آلودہ کی اور نہ قلم۔ اسی طرح غلو' خوشامد اور قصیدہ گوئی سے بھی کلام' پاک صاف نظر آتا ہے۔

شعروں کی تعداد تقریباً چوبیس ہزار ہے' اندازہ ہوتا ہے کہ سن شعور کی ابتدا ہی سے یہ شغل اختیار کر لیا تھا۔ ایک ہم وطن بزرگ شیخ بشیر علی بشیر (شاگرد آتش) سے تلمذ تھا۔ لسان العصر

سید اکبر حسین اکبر آور وحید عظیم آبادی حضرات ان کے شاگرد تھے۔

وحید کا پورا کلام ایک ایسا مرقع ہے جس میں صاف ستھری اور بامحاورہ زبان میں، جستہ جستہ عہدِ شباب کی رنگینیاں اور معاملات، زمانے کی نیرنگیاں اور انقلابات، تصوف کے مسائل اور اکثر شعروں میں سوز و گداز، اپنے کیف و اثر کے ساتھ موجود ہے، ان خصوصیتوں کے علاوہ اس دور کے مطابق طرح طرح کی صنعتوں، تجنیسوں اور دوسری شعری صناعیوں سے بھی کلام کو جابجا آراستہ کر دیا ہے۔

دو دیوان ان کی یادگار ہیں۔ ایک مرتّب دوسرا غیر مرتب۔ ان میں سے کسی ایک کے بھی طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک دیوان کے شروع میں یہ عبارت یادِ صیت درج تھی جس کے چند خاص جملے یہ ہیں "..... اس پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ غلطیاں کثرت سے ہیں۔ .... جو صاحب اسے چھپوائیں، لازم ہے کہ کسی اچھے شاعر کو دکھالیں ....."
نیک نفسی اور عالمانہ انکسار کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

انجمن ترقی اردو کی طرف سے ۱۹۳۹ء میں ایک انتخاب شائع ہوا تھا۔

انتخاب

حلاوت سے، مزے سے، لطف و شیرینی سے مملو ہے
زباں اپنی، سخن اپنا، کلام اپنا، بیاں اپنا

آنکھ بھی چاہیے نظارۂ وحدت کے لیے بُت کو آسان نہیں مُنہ سے خدا کہہ دینا

کس کی ہوائے شوق نے بھڑکائی دل کی آگ
جلتا ہوا چراغ ہوں میں کس کی راہ کا

سب وہ مجنوں ہی کے دم تک تھی تری آبادی — کوئی لیتا نہیں اب نام بیاباں تیرا
اے دل تجھے رونا ہے تو جی کھول کے رو لے — دنیا سے نہ بڑھ کر کوئی ویرانہ ملے گا

قیس نے صحرا لیا، فرہاد نے کہسار کو — بعد میرے سب علاقہ لُٹ گیا جاگیر کا

دیکھ لیتا جو تیری شادابی — دھوپ سے پھول نہ کمہلا سکتا

اب ہیں جہاں میں اپنے یہ القاب اے وحید — غربت نصیب، خاک بسر، خانماں خراب

مسکرائے اس گھڑی بے طور آپ — کچھ سوالوں کا مرے سوچا جواب

کیا پوچھتے ہو کیسے جو دل پہ لگی ہے چوٹ — ایسا نہ درد ہوتا تھا، اکثر لگی ہے چوٹ
پہلے سے ہم کو صدمۂ دل کی خبر تھی کیا — بتلائیے کسی کے بھی کہہ کر لگی ہے چوٹ

یاد آگیا ابرو کے قریں زلفوں کا آنا — آیا جو وحید، ابر مہِ نو کے برابر

سچ یہ ہے پسِ مرگ کہاں الفتِ احباب — آنے کو تو آئیں گے سرِ قبر کئی روز

کیا جی کہ ہجرِ یار میں ترسا رہی ہے یاس ‏ ‏ دیکھیے جدھر اُٹھا کے نظر چھا رہی ہے یاس

کرتے ہیں آپ کچھ گلہ کوئی کہے تو کہنے دو ‏ ‏ پھیر کے مُنہ کہ پھر کہو "ان سے ہی مجھ کو کیا غرض"

دیکھے دلِ شیدا کا تڑپنا کوئی کب تک ‏ ‏ ہاتھوں سے پکڑے نہ کلیجا کوئی کب تک

دکھلا رہے ہو لطفِ بہار و خزاں تمھیں ‏ ‏ گُل ہو تمھیں چمن ہو تمھیں باغباں تمھیں

دل کو روندے ہوئے پاؤں کے تلے جاتے ہیں
اُن سے کہہ دو کوئی آگے جو چلے جاتے ہیں

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا ‏ ‏ دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

کہہ چلے جی سے جب گزرنے کو ‏ ‏ اب نہ کہیے گا صبر کرنے کو

عشق کا نام لیا ہے تو ہو بہتر انجام ‏ ‏ اب تو بدنام نہ ہونے میں بھی رسوائی ہے

خوب سوجھی ہے میری آنکھوں کو ‏ ‏ عمر بھر اُن کی راہ تکنے کی
رہ گیا رازِ دل کا سر بستہ ‏ ‏ یہ کلی اب نہیں چٹکنے کی

کہا عمر بھر ہم نے دل کا فسانہ ‏ ‏ کبھی آخری داستاں تک نہ پہنچے

دنیا کے دور رہے سے کدھر جانتے ہیں دیکھیں
لائی وہیں وحشت، وہ جدھر ہی بھی، نہیں بھی

خیر اسی بات کی قسم کھاؤ آج سے کیا کبھی نہ بولو گے

آپ کے عشق نے دکھلا دیئے دونوں کے سلوک
اب گلہ کچھ ہے اپنے سے نہ بیگانے سے

امیر مینائی

۱۸۲۸ ——— ۱۹۰۰ء

امیر احمد نام، امیر تخلص، لکھنؤ میں پیدا ہوئے، نسب کا سلسلہ بہت قریب کے واسطے سے حضرت شاہ مینا (جن کا مزار لکھنؤ میں مرجعِ خاص و عام ہے) سے ملتا ہے اسی بنا پر مینائی جزو تخلص ہے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم و تکمیل مفتی سعد اللہ اور علمائے فرنگی محل (لکھنؤ) سے کی، طب، جفر اور نجوم سے بھی واقف تھے۔ شروع ہی سے نہایت ذکی، بڑے محنتی اور جفاکش رہے۔ ہوش سنبھالا تو لکھنؤ کی فضا میں شاعری گونج رہی تھی۔ آتش و ناسخ کے مناقشے، انیس و دبیر کے معرکے، دن رات کے ادبی مباحثے اور مشاعرے۔ بچپن ہی سے یہ بھی شعر و سخن کی طرف

مائل ہو گئے۔ اور نہایت کاوش و خلوص کے ساتھ اس فن کے رموز و نکات سے آگاہی و مہارت حاصل کرنے لگے۔

منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہوئے مگر اپنے مطالعے، ذہانت اور مختلف صلاحیتوں کی بدولت بہت جلد استاد سے زیادہ مقبول اور مشہور ہو گئے۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں نواب واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ دو کتابیں (ارشاد السلطان اور ہدایۃ السلطان) لکھ کر پیش کیں۔ عزت و توقیر میں اضافہ ہوا۔ خلعتِ فاخرہ سے نوازے گئے۔ سنہ ۱۸۵۷ء آگیا۔

پہلے دہلی اُجڑی تھی تو بادشاہت ختم ہوئی تھی۔ لکھنؤ کی باری آئی تو نوابی رخصت ہوئی۔ حسنِ اتفاق کہ دونوں جگہ کے شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست اور قدردان نواب یوسف علی خاں دائی رام پور کا ستارہ چمکا۔ بہتوں کے دن پھرے۔ امیر بھی رام پور پہنچے نواب کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ ۴۳ برس تک بڑے اطمینان اور یک سوئی کے ساتھ گزار کر سنہ ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد گئے۔ خاصی مان دان ہوئی۔ چند مہینے زندہ رہے۔ پھر وہیں کی خاک کے پیوند ہو گئے۔

امیر صورت اور سیرت دونوں لحاظ سے نہایت متین، ملنسار، متشرع متقی اور قابلِ احترام بزرگوں میں سے تھے۔ خاکساری اور دوستداری میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ہجو، تلخ گوئی، نازیبا اور خلافِ تہذیب الفاظ یا اندازِ گفتگو سے ہمیشہ اپنے آپ کو الگ رکھا۔ معاصرانہ چشمکوں سے بے تعلق اور لکھنؤ، دہلی کے خرخشوں سے آزاد رہنے کی کوشش کی۔ صداقت کے قائل اور حق پرستی کی طرف مائل رہے۔

شاعری کے علاوہ تصنیف وتالیف کے مشاغل میں زندگی بھر مصروف رہے۔ نظم ونثر ملا کر ان کی کتابوں کی کل تعداد اکیس تک پہنچتی ہے۔ بیشتر اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ مضمون آفرینی، نازک خیالی اور زبان وفن پر یکساں دسترس ان کی شاعری کی امتیازی خوبیاں ہیں۔ لطف یہ کہ امیرؔ کی یہ صفتیں اور صلاحیتیں عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور سنورتی رہیں۔ سینکڑوں شاگرد تھے جن میں محسنؔ، ریاضؔ، جلیلؔ، مضطرؔ اور صفدرؔ کا مرتبہ اور شہرت اُستادی کی حد تک پہنچتا ہے۔

"مراۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" کے علاوہ اُن کا ایک عظیم علمی کارنامہ "امیر اللغات" بھی ہے جس کی صرف دو جلدیں (الف ممدودہ اور الف مقصورہ) چھپ سکیں۔ اسکیم کے مطابق اگر اس کی آٹھ جلدیں مکمل ہو گئی ہوتیں تو اُردو زبان کا اس سے زیادہ مستند اور منضبط کوئی دوسرا لغت نہ ہوتا۔

انتخاب

قریب ہے یار روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

جب کہا اُس سے شبِ غم کوئی غم خوار نہ تھا
درد نے اُٹھ کے کہا: "کیا یہ گنہ گار نہ تھا"

مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل
کانٹا تھا ایک میں، سو چمن سے نکل گیا

کرتا ہیں دردمند طبیبوں سے کیا رجوع
جس نے دیا تھا درد بڑا وہ حکیم تھا

صورت تری دکھا کے کہوں گا میں روزِ حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

دیکھ اے درد جدا ہو نہ دلِ محزوں سے
اور اُلجھے گا یہ بیمار جو تنہا ہوگا

آگ جو دل میں لگی تھی وہ بجھائی نہ گئی
اور کیا تجھ سے بھلا اے دیدۂ گریاں ہوگا

ہاتھ رکھ کر میرے سینے پہ جگر تھام لیا
تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

ترے بندوں سے کرتے ہیں یہ بُت دعویٰ خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شانِ کبریائی کا

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

ہاتھ گلچیں کے کیے باغ میں کانٹوں نے فگار
خوب ہی پھوڑے ترے دل کے بھی چھالے بلبل

وہ اور وعدہ وصل کا، قاصد! نہیں نہیں!
سچ سچ بتا یہ لفظ انھیں کی زباں کے ہیں؟

نہ کرائے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو　　اسی گھر میں جلایا ہو چراغِ آرزو برسوں

کیا رنگ جہاں کے ہو رہے ہیں　　دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں
آئے گی نہ پھر کے عمرِ رفتہ　　ہم مفت میں جان کھو رہے ہیں
اربابِ کمال چل بسے سب　　سو میں ایک دو رہے ہیں
پھر اُس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے　　گناہ گار یہ کہہ دے گناہ گار ہوں میں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ　　اے اسیرانِ قفس میں نوگرفتاروں میں ہوں
وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر　　چیخ اٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہ گاروں میں ہوں

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو　　ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو
آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے　　اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لیے　　ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے
ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا　　میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے
وصل کا دن اور اتنا مختصر　　دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ　　سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

داؔغ

۱۸۳۱ ——— ۱۹۰۵ء

نواب مرزا خاں نام، داؔغ تخلص۔ نواب شمس الدین خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ کے فرزند۔ محلہ بلّی ماران (دہلی) میں پیدا ہوئے، چھے سات سال کی عمر میں یتیم ہوگئے، ان کی ماں اپنا دوسرا نکاح مرزا فخرو (شاہزادہ مرزا سلطان ابن بہادر شاہ ظفر) سے کرکے لال قلعہ منتقل ہوگئیں اور شوکت محل خطاب پایا۔ داؔغ کو سلطنت مغلیہ کی بیگمات کی گودوں میں کھیلنے اور شاہزادوں کی صحبت میں رہ کر پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ غیاث اللغات کے مولف مولوی غیاث الدین سے فارسی پڑھی اور مولوی احمد حسین سے عربی۔ خوش نویسی، شہ سواری اور بانک پٹے وغیرہ کا فن وقت کے بہترین استادوں سے سیکھا۔ پیدائشی طور پر شاعر تھے، حالات اور ماحول بھی سازگار نصیب ہوا، باپ دادا بلکہ پورا لال قلعہ استاد ذوقؔ کا شاگرد تھا انھوں نے بھی ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بیس برس کی عمر میں اپنی صلاحیتوں اور مشاقی کی بنا پر شاہی مشاعروں میں شرکت کا فخر حاصل ہونے لگا جب کہ وہاں اچھے اچھے کہنہ مشقوں کی رسائی آسان نہ تھی۔ مرزا غالبؔ جیسے سخن ور اور بادشاہ ظفرؔ جیسے جوہر شناس سے داد و تحسین حاصل کی۔ خوش گوئی

کے ساتھ ساتھ خواندگی کا انداز بھی بڑا دل کش تھا۔ چنانچہ استاد ذوق کی غزلیں بھی مشاعروں میں پڑھنے کے لیے انھیں کو ملتی تھیں۔

ناگاہ ۱۸۵۷ء آگیا، دلی کے بہت سے باکمالوں کی طرح ان کو بھی یہاں سے بادلِ ناخواستہ نکلنا پڑا۔ مگر جلد ہی "رام پور" اُن کے لیے بہت سی حیثیتوں سے "آرام پور" اور "دارالسرور" ثابت ہونے لگا۔ نواب کلب علی خاں کے عہد اور ان کی ملازمت میں عمر کے چوبیس سال بسر کیے۔ فراغت، شہرت اور مقبولیت ہر چیز ان کو میسر تھی، نواب کی وفات کے بعد ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد دکن پہنچے۔ میر محبوب علی خاں فرماں روائے ملک دکن نے ان کو اپنا استاد بنایا۔ سپہ سالار، یارِ وفادار، مقرب السلطان، بلبلِ ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ اور فصیح الملک یہ تمام خطابات ان کو نظام دکن کی سرکار سے عطا ہوئے۔ گراں قدر مشاہرہ، عزت و توقیر اس کے علاوہ۔ اپنے دور کے تنہا داغ ایک ایسے شاعر ہیں جن کی تمام عمر عشرت اور فارغ البالی میں بسر ہوئی۔

داغ بڑے وسیع المشرب، اعزہ پرور، احباب نواز، خوش باش اور رنگین طبع لوگوں میں سے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی بڑی وسیع اور کثیر ہے، اصلاح اور مشورے کا کام تمام عمر بڑی مستعدی اور باضابطگی سے انجام دیتے رہے۔ نوح ناروی، بیخود، سائل، رسا، نسیم بھرت پوری، احسن مارہروی، علامہ اقبال، زار دہلوی، جوش ملسیانی، جیسے استاد اور اکابر ان کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔

زبان میں فصاحت وسادگی اور بیان میں شوخی اور بانکپن داغ کی نمایاں خصوصیتوں میں سے ہیں۔ جرأت کی معاملہ بندی اور آتش کی صفائی زبان دونوں کا بہترین امتزاج داغ کے کلام میں موجود ہے ــــــ محاوروں کو خوش اسلوبی سے نظم کر کے زبان کو ٹکسال بنا دینا بھی داغ کا ایک امتیازی ہنر تھا، وہ صرف غزل کے شاعر تھے اور بڑے ہی کامیاب شاعر،

"گلزارِ داغ۔ آفتابِ داغ، ماہتابِ داغ" ان کی زندگی میں اور چوتھا دیوان "یادگارِ داغ" ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ایک مثنوی 'فریادِ داغ' اس کے علاوہ ہے۔ چوہتر سال کی عمر میں حیدرآباد میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

انتخاب

لگ گئی چپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کم بخت سُنا تو اپنا

ہو گئے ظاہر تو کیا عشق نے اک حشر بپا
حسرت اس دل پہ کہ جس دل میں یہ پنہاں ہوگا

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا رشک
کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

ڈوب کر سینے میں اس رنگ سے پیکاں نکلا
دل سے بے ساختہ نکلا کہ وہ ارماں نکلا

عرضِ وفا پہ دیکھنا اس کی ادائے دل فریب
دل میں کچھ اعتبار سا، آنکھوں میں کچھ ملال سا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا   خانۂ عشق بے چراغ ہوا

وعدے پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج
کل تابِ فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
کیا کیا لبِ خاموش پہ قرباں ہے اثر آج

بزمِ اغیار کا ظاہر ہے اثر آنکھوں پر
مہرباں آپ کی خفت مِرے سر آنکھوں پر

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر
دل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

دل میں سما رہی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغؔ نام نہیں

رہ روِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغؔ
ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت اِدھر کہاں

شررو برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے وہ چھپ کے جائیں گے ایسے کہاں کے ہیں

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے　　چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

ہر دل میں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری
یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

ایک تو حُسنِ بلا اس پہ بناوٹ آفت
گھر بگاڑیں گے ہزاروں کا سنورنے والے
خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد
ہم سے اچھے رہے صدقے میں اُترنے والے

جلالؔ

۱۸۳۴ء ——————— ۱۹۰۹ء

ضامن علی، نام، جلالؔ تخلص۔ قوم و نسب کے لحاظ سے سید اور رضوی، خاندانی پیشہ طبابت، لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اردو فارسی کی کتابیں اپنے والد میر اصغر علی سے پڑھیں، عربی اور کچھ آگے کی تعلیم کے لیے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں بٹھائے گئے تھے۔ مگر لکھنؤ کی فضا میں شعر و شاعری کا دور دورہ تھا یہ بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے اور باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اپنے خاندانی پیشے طبابت کی طرف کچھ دنوں توجہ رہی، تھوڑے دنوں تک لکھنؤ میں باقاعدہ مطب بھی کیا مگر بالآخر شاعری ہی کو ذریعۂ معاش قرار دے لیا۔

شروع میں جلالؔ نے امیر علی خاں ہلالؔ کو اپنا کلام دکھایا، اس کے بعد میر علی اوسط رشکؔ کے شاگرد ہوئے، وہ کربلائے معلیٰ چلے گئے تو نواب فتح الدولہ برقؔ کو اپنا اُستاد بنا لیا۔ برقؔ بھی جب نواب واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیابرج (کلکتہ) چلے گئے تو پھر جلالؔ کے لیے اس کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ کسی نئے آگے زانوئے تلمذ تہ کریں مذاقِ مشقِ سخن اور زبان دانی کی بنا پر اُستادی کے درجے تک پہنچ چکے تھے۔ ناسخؔ کی جو خوبیاں اور خصوصیتیں تھیں

وہ سب رشک اور برق کے ذریعے جلال تک منتقل ہو چکی تھیں۔

واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد شعرا۔ اور دوسرے اہلِ کمال حضرات کا لکھنؤ میں کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ خوش قسمتی سے جلال کے والد بزرگوار کو رام پور میں "داستان گو" کی حیثیت سے ملازمت مل چکی تھی۔ انھیں کے توسط سے نواب یوسف علی خاں نے جلال کو بھی اپنی ریاست میں بلا لیا۔ معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر جلال کو رام پور میں شعر و سخن کے ساتھ ساتھ مطالعے کا بھی خوب موقع ملا۔

نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں کے دور میں جلال کی پہلی جیسی قدر و منزلت نہ رہی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جلال ایک صاف گو اور بے باک قسم کے آدمی تھے شعر و ادب کے معاملے میں وہ کسی کی رو رعایت نہ کرتے۔ خواہ وہ نواب کلب علی خاں ہی کیوں نہ ہوں تقریباً بیس سال رام پور میں رہ کر وہ لکھنؤ واپس آگئے۔ تھوڑے دنوں بعد منگرول کے نواب شیخ حسین میاں نے ان کو اپنی ریاست میں بلا کر بڑی عزت و توقیر کے ساتھ رکھا مگر جلال وہاں بھی زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے، اپنے صاحبزادے کو اپنی جگہ چھوڑ کر وطن لوٹ آئے۔

پیرانہ سالی اور آنکھوں میں ناسور ہو جانے کے باعث ان کی آخری عمر تکلیفوں اور مالی پریشانیوں میں گزری۔ اس حالت میں بھی اصلاح و مشورے کا کام، اور تن پیٹ کے لیے معاوضہ لے کر غزلیں لکھ کر دینے کی مشقت برابر جاری رہتی تھی۔

جلال فنِ عروض کے زبردست ماہر تھے۔ لکھنؤ کی شاعری کی

بعض ناپسندیدہ باتوں کو انھوں نے بڑی خوبصورتی اور جسارت کے ساتھ دور کیا۔

ان کے چار مطبوعہ (شاہدِ شوخ طبع۔ کرشمہ گاہ سخن ۔ مضموں ہائے دل کش۔ نظم نگارین) اور ایک غیر مطبوعہ دیوان۔ اس کے علاوہ سات نثر کی کتابیں (منتخب القواعد۔ سرمایہ زبان اردو۔ گلشنِ فیض۔ تنقیح اللغات۔ افادہ تاریخ۔ رسالہ عروض و قوافی اور مفید الشعرا) اس بات کا زبردست ثبوت ہیں کہ انھوں نے اپنی تمام عمر اور توجہ شعر و سخن کی قدر افزائی اور زبان و فن کی اصلاح و خدمت میں صرف کی۔

انتخاب

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو بھول گئے ہم کو داغ بھی نہ ملا

جس دل کو پوچھتا تھا، وہ ہم نے بتا دیا
لے دردِ عشق تجھ کو ٹھکانے لگا دیا

حسرتیں پوچھیں جو اے عشق ٹھکانا دل کا
نہ بتانا انھیں مسکن نہ بتانا دل کا

خودی سے اُدھر نہ جائیں گے ہم
آیندہ جو قصد بے خودی کا

یہ کیوں ہے جان بے چین آج کس پر اپنا جی آیا
پکارا بے بلائے اضطرابِ دل کہ "جی" آیا

مری داستانِ فراق نے شبِ وصل طرفہ مزا دیا
کبھی میں نے رو کے ہنسا دیا، کبھی اس نے ہنس کے رُلا دیا

آستاں بوس تھے جس در کے وہ در چھوڑ دیا
بھاری پتھر تھا فقط چوم ہی کر چھوڑ دیا
گرمیٔ آہ نے کیا جلد اثر چھوڑ دیا
لب کو تو خشک کیا، آنکھ کو تر چھوڑ دیا
دھوم نالوں کی ہے، اک شور ہے فریادوں کا
خوب آباد ہے کوچہ ستم ایجادوں کا

دل ہمارا اور یوں ہو جائے ہم سے منحرف
آج اُن کی کج ادائی کا گلہ جاتا رہا

مجھے جان دے کے اتنی بخدا خوشی نہ ہوتی
مرے مرنے کا ذرا بھی جو تمہیں ملال ہوتا

تغافل کے گِلے سُن کے جُھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا

یہ اشکِ حسرت جو گر پڑا ہے تمھارے آگے ابھی ٹپک کر
اسی نے آنکھوں میں صبح کی ہیں ہزاروں راتیں کھٹک کھٹک کر

تم حضرتِ دل اور مدارات کے قابل
کہنا جو نہ مانے وہ نہیں بات کے قابل

کس کی محشر میں ہم کریں فریاد
دادرِ حشر ہو تمھیں نہ کہیں

کرشمے لاکھ ہیں اُن کی ادائیں!
ہزاروں شوخیاں ہیں اک حیا میں
بہت پچھتائے اک بے درد کو ہم
جگہ دے کر دلِ درد آشنا میں

ایسے گئے کہ پھر نہ ادھر آئے تم کبھی
کیا میری عمرِ رفتہ ہو، میرے شباب ہو
مُنہ ڈھانکتے ہو کیوں مری میّت پہ آ کے تم
آنکھیں ہیں بند شوق سے اب بے حجاب ہو

ٹنک کے زلفیں جو آپڑی ہیں کمر کسی کی لچک رہی ہے
بلا کی آئی ہیں وہ گھٹائیں غضب کی بجلی چمک رہی ہے

چلتے ہیں پیرِ مغاں اور کوئی جام سہی
نقد تو پی ہے بہت، تھوڑی سی بے دام سہی

اٹھا کیوں یہ دردِ جگر بیٹھے بیٹھے
کوئی یاد آیا مگر بیٹھے بیٹھے
چلو دشت کو کہتی ہے وحشتِ دل
ہم اکتا گئے اب تو گھر بیٹھے بیٹھے

کرے خبر اُس خانہ بر انداز سے کوئی
روتا ہے کہیں درد کی آواز سے کوئی
اللہ رے غمزے ترے اے موت شبِ ہجر
معشوق بھی آتا نہیں اس ناز سے کوئی
کیا دہشتِ صیاد ہے مرغانِ چمن کو
روتا نہیں شبنم صفت آواز سے کوئی

حالی

۱۸۳۶ ـــــــــ ۱۹۱۴ء

الطاف حسین نام، حالیؔ (اور کچھ دن کے لیے خستہؔ) تخلص۔ باپ کی طرف سے شیخ انصاری اور ماں کی طرف سے سیّد۔ پانی پت میں پیدا ہوئے تھے، ان کے مورث اعلیٰ خواجہ ملک علی، جو اپنے دور کے مشہور عالم تھے ہرات سے سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہندوستان آئے اور حکومت کی جانب سے پانی پت کے قاضی مقرّر ہوئے۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش کا انتقال اُس وقت ہوا جب حالیؔ کی عمر صرف نو سال کی تھی۔ ماں پہلے ہی سے ایک دماغی عارضے میں مبتلا تھیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی اور بڑی بہن کی نگرانی میں ہوئی۔ پہلے قرآن حفظ کیا اس کے بعد فارسی اور عربی کا درس شروع ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں شادی کر دی گئی۔ تعلیم حاصل کرنے کی دھن میں گھر والوں کو بتائے بغیر دہلی چلے آئے۔ ایک سال یہاں رہ کر تحصیل علم کر پائے تھے کہ عزیزوں نے اصرار کر کے وطن بلا لیا۔ وہاں انھوں نے اپنا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے ہی میں صرف کیا۔

۱۸۶۳ء میں حالیؔ کو نواب شیفتہ کے ساتھ بطور مصاحب

اور ان کے منجھلے بیٹے کے اتالیق کی حیثیت سے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں حالی کی بہت سی صلاحیتوں کا لوگوں کو علم ہوا۔ مرزا غالب (جنھوں نے ۵۵-۱۸۵۴ء میں حالی کو شعر کہنے کی ترغیب دی تھی) سے باضابطہ تلمذ کا بھی یہی زمانہ تھا۔

شیفتہ کی وفات کے بعد ۱۸۷۰ء میں حالی لاہور پہنچے اور چار سال تک سرکاری بک ڈپو میں قابلِ اشاعت کتابوں کی درستیٔ زبان کا کام انجام دیتے رہے۔ پھر عربک انیگلو کالج دہلی میں آکر عربی فارسی کے مُدرس اوّل مقرر ہو گئے۔ یہیں سر سید احمد خاں سے ملاقات ہوئی اور ان کی تحریک پر ۱۸۷۹ء میں "مدّ وجزر اسلام" (مسدس حالی) قلم بند کی۔ ۱۸۹۱ء میں جب ریاست حیدر آباد سے سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر ہو گیا تو مستقل طور پر وطن (پانی پت) میں آکر اقامت پذیر ہو گئے اور آخر وقت تک علم و ادب کی گراں بہا خدمت میں مصروف و منہمک رہے۔

اُردو کے کم ہی ادیب اور شاعر ایسے ہیں جن کو حالی کے برابر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ بہ یک وقت بہترین نثار اور لاجواب شاعر تھے۔ آج بھی ان کا نام اور کلام بچے بچے کی زبان پر ہے۔ ان کا سا خلق و کرم اور انکسار بھی کم ہی لوگوں کے نصیب میں آیا ہوگا۔ انھوں نے اپنی کسی کتاب کے حقوق نہیں محفوظ کرائے قوم کی پستی اور طبقۂ نسواں کی بے چارگی کو جس درد کے ساتھ انھوں نے محسوس کیا اور جس خلوص اور تاثر کے ساتھ اس کو

ظاہر کیا ہے اس کی مثال ان کے دور کے کسی ادیب یا شاعر کے یہاں نہ مل سکے گی۔

قدیم ماحول اور معاشرے کے پروردہ اور تربیت یافتہ ہونے کے باوجود انھوں نے بڑی فراخ دلی، وسعتِ نظر اور جسارت کے ساتھ اردو شاعری کے نقائص واضح کیے۔ مولوی محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر نئی اور بامقصد شاعری کی بنیاد ڈالی۔

"حیات سعدی"، "یادگار غالب"، "حیاتِ جاوید" اور "مقدمہ شعر و شاعری" ان کے عظیم نثری کارناموں میں شمار ہوتے رہیں گے دیوان، مسدس اور نظموں کے متعدد مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اُردو کے صفِ اوّل کے شعرا میں سے ہیں۔

انتخاب

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کوئی آسماں نہ تھا

عشق سنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل!
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اک خوسی ہو گئی ہے، تحمل کی ورنہ اب — وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل — کیا اعتبار، زندگیِ مستعار کا

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

تعزیرِ عشق جرم ہے، بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ایک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اُس کو ربط ہم سے مگر اِس قدر کہاں
ہم جب یہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت　　ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

مسدّس (مدّو جزر اسلام)

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی — اک آواز میں ساری بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم — نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم — کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر — نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر — پڑے غم کا سایہ نہ اس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

مناجات

ہر دل میں ہے تیرا بسیرا — تو پاس اور گھر دور ہے تیرا
تو ہے ٹھکانہ مسکینوں کا — تو ہے سہارا غمگینوں کا

تو ہے اکیلوں کا رکھوالا تو ہے اندھیرے گھر کا اُجالا
سوچ میں دل بہلانے والا بیتا ہیں یاد آنے والا
تو ہی ڈبوئے تو ہی ترائے
تو ہی یہ بیڑے پار لگائے

حُبّ وطن

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی تیلیاں سب کو
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی
جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

رباعی

بُلبل نے چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

دنیا کے ساز و نقش فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

رقمہ عبدالباری اعظمی
۱/۱۲/۶۷

فروری ۱۹۶۸ء

غزل سرا (اُردو)

اُردو غزل گو شعرا میں سے ۱۲ مشہور شعرا کی غزلوں پر مجنوں صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مقالوں کا مجموعہ۔ یہ مقالے جو تنقید نگاری کے اصول اور معیار پر پورے اُترتے ہیں، نہایت دیانت داری۔ اور ذمّے داری کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ مجنوں صاحب کے ہاں تنقید کا پہلو زیادہ جان دار، زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے اس لیے نئے تنقید نگاروں کو جن کے لیے یہ کتاب شمعِ ہدایت کا کام دے گی، اِس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

سائز $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ صفحات — ۲۰۲

مجلد قیمت :— ‎-/۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، دہلی